

دورگاہ کی اداکاری



عالمی ادبیات

ایک پچھلی یادداشت (ڈریگولا کا خاتمہ)

مینا ہار کر کارو زنا چ

۶ نومبر۔ دوپہر اُٹھ رہی تھی کہ ہم مشرق کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی طرف سے میرا جتنا تھن آ رہا ہے۔ یوں میرا دل کتا تھا۔ ہماری رفتار تیز نہ تھی۔ حالانکہ ہم ڈھلان اتر رہے تھے۔ ہم مال و سامان سے لدے ہوئے تھے۔ کمبلوں اور اشیائے خورد و نوش کا کافی ذخیرہ ہمارے پاس تھا۔ ہم یہ سامان پھینک دیتے لیکن یہ خطہ جہاں ہم سفر کر رہے تھے۔ بالکل غیر آباد تھا۔ کوئی ایک میل چلنے کے بعد میں تھک کر بیٹھ گئی۔ ہم نے پیچھے دیکھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر نیلے آسمان کے پس منظر قعر ڈریگولا اپنی تمام تربیت ناکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور اس کے پیچھے ننگے ننگے پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ اور سامنے برف سے ڈھکا ہوا راستہ تھا جو بلندیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ ہر طرف وحشت برس رہی تھی اور کہیں دور سے بھیڑیوں کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ پروفیسر صاحب کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں ہم تھوڑی دیر کے لئے سستالیں اور بھیڑیوں سے محفوظ رہیں۔

سواروں کا ایک گروہ بھاگ بھاگ چلا آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے حلقے میں ایک چمکڑا تھا۔ جو کچی سڑک پر بری طرح اچھل اور ڈول رہا تھا۔ ان لوگوں کو پہچاننے میں مجھے دیر نہ لگی۔ ان کا لباس اور وضع قطع بتا رہی تھی کہ وہ خانہ بدوش ہیں۔

چمکڑے میں ایک بڑا سا چوکور تابوت رکھا ہوا تھا جسے دیکھتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ انجام قریب تھا۔ شام ہو چلی تھی۔ اور میں جانتی تھی کہ سورج غروب ہوتے ہی ”وہ“ جس تابوت میں سویا ہوا ہے، تابوت سے نکل کر اور روپ بدل کر فرار ہو سکے گا۔ اس خیال نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ میں پروفیسر صاحب کی طرف پلٹی لیکن وہ وہاں نہ تھے۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ پروفیسر صاحب چٹان کے قدموں میں لکڑی کی نوک سے دائرہ کھینچنے میں مصروف تھے۔ جیسا کہ ہگزشتہ رات کھینچا تھا۔ دائرے کے محیط پر مقدس روٹی کے ٹکڑے بکھیر کر وہ میرے پاس آئے اور بولے۔

”اس دائرے میں تم کم سے کم اس عفریت سے تو محفوظ ہو۔“

انہوں نے میرے ہاتھ سے دور بین لے کر اپنی آنکھوں سے لگالی۔ چند ثانیوں کے لئے برف گرنا بند ہو گئی۔ پروفیسر صاحب نے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بہت غلت میں ہیں۔ گھوڑوں پر بے تحاشہ جا بک برسا رہے ہیں۔“

اور پھر چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

”وہ لوگ سورج غروب ہونے سے پہلے منزل تک پہنچ جانا چاہتے ہیں، مینا! ہم

شاید جیتی ہوئی بازی ہارنے والے ہیں۔ خیر! جو خدا کی مرضی۔“

برف گرنے لگی اور ہم کچھ دیکھ نہ سکے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی برف گرنا پھر بند

ہو گئی۔ پروفیسر صاحب نے دور بین آنکھوں سے لگالی اور چند لمحوں بعد خوشی سے چیخ

تھوڑی دیر بعد پروفیسر صاحب نے اشارے سے مجھے بلایا۔ میں اٹھ کر ان کے پاس پہنچی۔ انہوں نے بے حد اچھی جگہ تلاش کر لی تھی۔ چٹانی سلسلے میں ایک شکاف تھا جس میں داخل ہونے کا دروازہ نچا اور مخرباں تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اس شکاف میں لے گئے۔

”مینا! یہاں تم سردی اور برف سے محفوظ رہو گی۔“ انہوں نے کہا۔ ”اگر بھیڑیے آگئے تو ہم پر چاروں طرف سے حملہ نہ کر سکیں گے۔ اور میں شکاف کے دہانے پر کھڑا ہو کر آسانی سے ان کا مقابلہ کر سکوں گا۔“

وہ باہر جا کر کمبل اور دوسری چیزیں اٹھا لائے۔ میرے لئے بستر تیار کیا اور کھانا نکال کر مجھے مجبور کیا کہ میں تھوڑا سا کھالوں۔ لیکن میں نہ کھا سکی۔ خدا جانے کیوں کھانا دیکھتے ہی میرا جی مٹانے لگا۔ کوشش کے باوجود میں ایک لقمہ بھی نہ کھا سکی۔ پروفیسر صاحب اداس ہو گئے لیکن منہ سے کچھ نہ کہا اور نہ ہی مجھے پھر مجبور کیا۔

اپنی دور بین لے کر وہ قریب کی چٹان پر چڑھ گئے اور اسے آنکھوں سے لگا کے افق کا جائزہ لینے لگے۔

”مینا! مینا! دیکھو۔“

میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچی۔ انہوں نے دور بین مجھے دے کر ایک طرف اشارہ کیا۔ اب برف باری کچھ زیادہ ہی ہو رہی تھی۔ اور ہوا میں بھی تیزی آگئی تھی۔ کبھی کبھی ہوا برف کو اڑا لے جاتی یا پھر تھوڑی دیر کے لئے برف گرنا بند ہو جاتی تو میں دور دور تک دور بین کی مدد سے دیکھ سکتی تھی۔

ہمارے قدموں میں برف سے ڈھکا ہوا میدان حد نظر تک پھیلا ہوا تھا اور دور بہت دور ایک سیاہ لکیر اس میدان میں سے گزر رہی تھی جو غالباً دریا تھا۔ اور ہمارے سامنے اور اتنے قریب کہ مجھے حیرت ہوئی کہ ہماری نظر ان پر کیوں نہ پڑی۔ گھر

کرو۔

”ہینا! دیکھو! دیکھو! دو گھڑ سوار حیرت انگیز رفتار سے چکڑے کی طرف آرہے ہیں۔ دونوں شمال کی طرف سے آرہے ہیں اس لئے یقیناً ہمارے دوست کوئی اور جان ہیں۔ لویہ دور بین اور اس سے پہلے کہ برف دوبارہ گرنے لگے انہیں پہچاننے کی کوشش کرو۔“

میں نے دور بین لگا کے شمال کی طرف دیکھا وہ دونوں ڈاکٹر سینوڈ اور کوئی ہی تھے کیونکہ ان میں سے ایک بھی جناح کا ساندہ تھا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ جناح بھی زیادہ دور نہیں۔ میں نے جنوب کی طرف دیکھا اور میرے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ دوسرے دو گھڑ سوار خطرناک تیز رفتاری سے بھاگے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک، میں نے پہچان لیا، جناح تھا چنانچہ دوسرا آر تھا۔ وہ دونوں بھی چکڑے کی طرف ہی آرہے تھے۔ میں نے پروفیسر صاحب کو ان دونوں کی آمد کی اطلاع دی تو وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ انہوں نے مجھ سے دور بین لے لی اور ان کی طرف دیکھنے لگے۔ یہاں تک کہ برف کا ایک ریلہ گرا اور ہماری نظروں کے سامنے سفید چادر سی تن گئی۔ پروفیسر صاحب چٹان کے شکاف میں گھس کر وچسٹر بندوق لے آئے اور ایک پتھر کے سارے کھڑی کر کے بولے۔

”وہ لوگ بڑی تیزی سے آرہے ہیں چنانچہ ہم جلد ہی ان خانہ بدوشوں کے زمرے میں ہوں گے۔ اسی خیال سے میں بندوق نکال لایا ہوں۔“

میں نے بھی اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ بھیڑیوں کے چلانے کی آوازیں قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ چنانچہ چند ثانیوں کے لئے برف گرنی بند ہوئی تو ہم نے پھر آنے والوں کی طرف دیکھا۔ عجیب بات تھی کہ برف ہمارے چادوں کی طرف گر رہی تھی لیکن افق مغرب میں سورج چمک رہا تھا۔ وہ بلند پہاڑیوں کے پیچھے

چھپنے کے لئے تیزی سے ڈھل رہا تھا۔ میں نے چادوں سمٹوں کا جائزہ لیا اور ہر چار طرف سے بڑے بڑے ہمایاک سائے ہماری طرف بڑھتے نظر آئے۔ یہ بھیڑیے تھے۔

ہم بے چینی سے منتظر تھے کہ کیا ہوتا ہے۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک سال ہو رہا تھا۔ یکایک ہوا تیز ہو گئی اور برف کے گالے رقص سا کرنے لگے اور چند ثانیوں بعد ہی فضا صاف تھی۔ اور اب ہم دور تک دیکھ سکتے تھے۔ پچھلے چند مہینوں سے ہم سورج کے طلوع و غروب کی طرف اتنے متوجہ ہو رہے تھے کہ اب ہم جانتے تھے کہ وہ کب طلوع اور کب غروب ہوتا ہے۔ اور یہ کہ اس طلوع و غروب کی علامتیں کیا ہیں۔ ہمیں چٹان پر کھڑے ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ آنے والے بہت قریب آگئے۔ ہوا بہت زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ جیسے ہمیں چٹان پر سے گرا دینا چاہتی ہو۔ کبھی کبھی برف کا ریلہ آجاتا تھا ورنہ زیادہ تر فضا صاف ہی رہتی تھی۔ اب میں آنے والوں میں سے ہر ایک کو، یعنی جن کا تعاقب کیا جا رہا تھا اور جو تعاقب کر رہے تھے، بخوبی دیکھ اور پہچان سکتی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ لوگ جن کا تعاقب کیا جا رہا تھا، کرنے والوں کی طرف متوجہ نہ ہوئے یا تو خانہ بدوشوں نے انہیں دیکھا نہ تھا یا اگر دیکھا تھا تو ان سے ڈرتے نہ تھے۔ تاہم انہوں نے اپنی رفتار دگنی کر دی۔ سورج لمحہ بہ لمحہ ڈھلنا جا رہا تھا۔ خانہ بدوش بار بار سورج کی طرف دیکھتے اور گھوڑوں پر چابک برسائے لگتے چمکڑا زیادہ ڈولنے لگا اور گھوڑے اپنی رفتار تیز کر دیتے۔

آنے والے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ میں اور پروفیسر صاحب پتھر کے پیچھے چھپ گئے۔ ہم دونوں بندوق اور پستول لئے تیار بیٹھے تھے۔ پروفیسر صاحب کے اوارے سے ظاہر تھا کہ وہ خانہ بدوشوں کو ہمیں روک لینے کا فیصلہ کئے ہوئے ہیں، خانہ بدوش اور ہمارے ساتھی بھی ہماری موجودگی سے بے خبر تھے۔

دھنسا دو آدمیوں نے ایک زبان ہو کر اور چیخ کر کہا۔
”رک جاؤ۔“

ایک آواز جناح کی تھی اور دوسری ڈاکٹر سیورڈ کی تھی۔ خانہ بدوش یقیناً اس زبان سے، جس میں انہیں رک جانے کا حکم دیا گیا تھا واقف نہ تھے لیکن لب و لہجہ سے ہر آدمی، خواہ وہ کتنا ہی بے وقوف کیوں نہ ہو، اندازہ لگا سکتا تھا کہ اسے کیا حکم دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ خانہ بدوشوں نے اپنے گھوڑوں کی لگا میں کھینچ لیں۔ بیک وقت ایک طرف سے کون سی اور ڈاکٹر سیورڈ اور دوسری طرف سے جناح اور آر تھر خانہ بدوشوں کے گردہ کی طرف بڑھے۔ خانہ بدوشوں کے سردار نے جو ایک تو مند گھوڑے پر قسطنطنیہ کی طرح سوار تھا اور نوجوان تھا خطرے کی بو پا کر اور چیخ کر کچھ کہا۔ یکایک خانہ بدوشوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی ہو ا میں چابک بلند ہوئے۔ شراب کی آواز آئی اور گھوڑے بے تحاشہ بھاگ پڑے۔ چاروں تعاقب کنندگان نے بندوقوں کی ٹالیاں خانہ بدوشوں کی طرف کر دیں۔
”رک جاؤ“ انہوں نے حکم دیا۔

عین اسی وقت میں اور دان پلسنگ بھی پتھر کے پیچھے سے نکل آئے ان کی بندوق اور میرے پستول کا رخ بھی خانہ بدوشوں کی طرف تھا یہ دیکھ کر کہ وہ گھر گئے خانہ بدوشوں نے گھوڑے روک لئے۔ سردار نے پھر کچھ کہا اور ہر آدمی نے وہ ہتھیار ... چاقو، چھری، نیزا، پستول جو جس کے پاس تھا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ فریقین مارنے مرنے پر تل گئے خانہ بدوش چھکڑے کو اپنے حلقے میں لئے تیار کھڑے تھے۔

یکایک خانہ بدوشوں کا سردار اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کے آگے بڑھا اور پہلے غروب ہوتے ہوئے سورج اور پھر قصر ڈر کی لاک کی طرف اشارہ کر کے ہمارے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ جواب میں ہمارے ساتھی فوراً گھوڑوں پر سے اتر پڑے اور چھکڑے کی طرف

بڑھے۔ کوئی اور وقت ہو تا تو میں خوف سے چیخ اٹھی ہوتی لیکن اس وقت ہم بھی اتنے ہی خطرے میں تھے جتنے کہ ہمارے ساتھی۔ اگر ان کے سروں پر موت منڈلا رہی تھی تو ہم بھی اس کے پھول کی پھڑ پھڑا ہٹ سن رہے تھے۔ چنانچہ دہشت زدہ ہونے کے بجائے میرا جی اپنے ساتھیوں کی مدد کرنے کو چاہا۔ ہمارے ساتھیوں کو یوں بڑھتے دیکھ کر نوجوان سردار نے پھر کچھ کہا اور خانہ بدوشوں نے چھکڑے کے گرد اپنا حلقہ تنگ کر لیا۔

اور ہم نے دیکھا کہ ایک طرف سے جناح اور دوسری طرف سے کوئی خانہ بدوشوں کا حلقہ توڑتے ہوئے چھکڑے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے اپنا کام پورا کر لینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت اب انہیں نہ روک سکتی تھی۔ کوئی چیز ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکتی تھی۔ حتیٰ کہ غروب ہوتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں چمکتے ہوئے خانہ بدوشوں کے جان لیوا چاقوؤں کی بھی انہوں نے پردانہ کی۔ اور نہ بھیڑیوں کی آواز ہی جو دم بدم قریب ہوتی جا رہی تھی، انہیں اپنی طرف متوجہ کر سکی۔

جناح ایسے جوش سے بڑھا تھا کہ خانہ بدوش مرعوب ہو کے دائیں بائیں دب گئے اور اسے گزر جانے دیا۔ دوسرے ہی لمحے جناح کوڈ کر چھکڑے پر چڑھ گیا اور حیرت انگیز پھرتی سے تابوت اٹھا کے نیچے لٹکا دیا۔ خدا جانے اتنی طاقت اس میں کہاں سے آگئی تھی۔ ادھر کوئی کو چھکڑے تک پہنچنے میں قوت بازو سے کام لیتا پڑا وہ خانہ بدوشوں کا حلقہ توڑتا اور انہیں دائیں بائیں دھکیلتا ہوا آگے بڑھا۔ بہت سے چاقوؤں کے پھل غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں چمک کر کوئی کی طرف نہ جھٹکے تھوڑی دیر تک ہمیں کوئی نظر نہ آیا اور پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا خانہ بدوشوں کے گردہ میں سے نکلا اور اب وہ جناح کے قریب کھڑا تھا۔

تابوت میں بھی ہوئی مٹی میں مل گیا۔

میں عمر بھر اس خیال سے خوش ہوتی رہوں گی کہ اس وقت جب جناح کا چاقو اس کے حلق پر چل رہا تھا اور کوئی کا چاقو اس کے سینے میں اتر گیا تھا تو کونٹ کے بشرے سے تشکر اطمینان اور سکون کے جذبات ہو رہا تھا۔ جیسے وہ صدیوں کی غلامی کے بعد آج آزاد ہو رہا ہو۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور سرخ افق کے پس منظر میں پہاڑ کی چوٹی پر قدیم اور بوسیدہ دیواروں والا قصر ڈریکولا جیسے سو رہا تھا۔۔۔۔۔ پر ہیٹ اور عظیم۔۔۔۔۔



اس عرصے میں جناح چھکڑے پر سے اتر آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کوئی اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھا اور اس کی انگلیوں کے بیچ میں سے جیتا خون ٹپک رہا تھا۔ وہ زخمی ہو گیا تھا۔ لیکن زخم کی پروا کئے بغیر وہ جناح کی مدد کرنے میں مصروف ہو گیا۔ جو اپنے بڑے چاقو سے تابوت کا مکن کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی پائنتی کی طرف سے ڈمکن کھولنے لگا۔ دونوں نوجوانوں کی انتھک کوششوں کے بعد کیلیں اکھڑ گئیں اور انہوں نے ڈمکن اٹھا کے ایک طرف پھینک دیا۔

خانہ بدوش خاموش کھڑے دیکھتے رہے کیونکہ ڈاکٹر سیورڈ اور آر تھر کی بندوقوں کی ٹالیاں انہیں کی طرف تھیں۔ سورج پہاڑیوں کی چوٹی پر اٹک سا گیا تھا۔ وہ غروب ہونے کے قریب تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ تابوت میں مٹی پر ڈریکولا دراز تھا۔ تھوڑی سی مٹی اس کے بدن پر بھی بکھر گئی تھی۔ کیونکہ جناح نے تابوت چھکڑے پر سے زمین پر لڑھکا دیا تھا۔ کونٹ ڈریکولا کا رنگ موم بنی کی طرح سفید تھا۔ اس کی آنکھیں خباثت سے چمک رہی تھیں اس کی آنکھوں کی اس چمک سے میں واقف تھی۔

کونٹ ڈریکولا نے نظریں گھما کے غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹ فتح مندانہ مسکراہٹ کی صورت میں اس کے نکیلے دانتوں پر کھنچ گئے۔ لیکن عین اسی وقت جناح کے چاقو کا لمبا پھل سورج کی شعاعوں میں چمکا اور دوسرے ہی لمحے وہ کونٹ کے حلق میں دسے تک اتر رہا تھا۔ جناح کا ہاتھ پھر بلند ہوا۔ اور اب وہ کونٹ کو ذبح کر رہا تھا۔ مارے دہشت کے میں چیخ پڑی۔۔۔۔۔ اسی وقت کوئی کا چاقو کونٹ کے سینے میں تیر گیا۔

یہ ایک خواب ہو سکتا ہے یا پھر مجرّم۔ لیکن وہ نہ خواب تھا اور نہ مجرّم تاہم ہم نے حیرت سے دیکھا کہ کونٹ ڈریکولا کا بدن ریزہ ریزہ ہونے لگا۔ اور پھر مٹی ہی کے

پہلا باب

کار ہتھیا جانے والا راستہ شروع سے ہی خراب اور غیر ہموار تھا اور جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا بڑی باقاعدگی سے۔۔۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ بے قاعدگی سے اور بھی زیادہ خراب اور تکلیف دہ بنتا جا رہا تھا۔ اندھیرا اور اس جنگل راستے کے دونوں کناروں کے زیادہ سے زیادہ قریب آتا جا رہا تھا جیسے اس باقی کچے راستے کو کچل کر اسے معدوم ہی کر دے گا۔ افق کے پس منظر میں دھرتی کی کوہان کی طرح ابھرے ہوئے کالے کالے مہیب سائے گردے لٹے ہوئے سنگلاخ خطے پر پڑ رہے تھے اور اس پورے اداس منظر کو ایسا ہمارے تھے کہ خواہ مخواہ دل پر بیت طاری ہونے لگتی تھی۔

کوچ گاڑی کے گھوڑے ٹھوکریں کھا رہے تھے اور گاڑی کے پیچھے غیر ہموار ہڑک پر پڑے ہوئے روڈوں اور پتھروں سے ٹکرا کر سامنے میں بے ہنگم سی گرج پیدا کر رہے تھے، گاڑی بری طرح سے اچھل رہی تھی، اس کا ایک ایک حصہ جیسے احتجاجاً چرچا رہا تھا اور اس میں بیٹھے ہوئے چار مسافر پیندے میں سیسہ بھرے ڈبوں کی طرح دائیں بائیں ڈول رہے تھے اور ان کے سر آپس میں ٹکرانے سے بال بال بچ جاتے تھے۔

ارد گرد کا ویران وحشت انگیز منظر سفر کے ابتدائی حصے میں بڑا مسحور کن معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ اعصاب پر سوار ہونے لگا تھا۔ منظر کی اداسی اور ویرانی اور اس پر چھائی ہوئی مروہ سی خاموشی اب بیزار کرنے لگی تھی۔ پورے خطے پر دھند لگا چھا گیا تھا اور سائے کا افق اندھیرا اور طوفانی ہو چلا تھا چاروں مسافر اب کسی ہوٹل کے گرم

ایک خوفناک ناول

اور اس واقعہ کے دس سال بعد ڈریکولا کی واپسی

اب ان کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو درد نہ کر رہا ہو اور یہ سب چارلس کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ نہ ضد کرتا اور نہ وہ لوگ اس علاقے میں گھتے اس کے باوجود کسی نے اسے سرزنش نہ کی شاید اس لئے کہ وہ سب کے سب اپنے حالوں میں پریشان تھے۔ اندر اتر چکا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اس قدر گہرا ہو گیا کہ کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ کوچان راستہ دیکھ سکتا ہے۔ لیکن شاید اس اندھیرے میں بھی، جہاں ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دیتا تھا۔ اسے شاید راستہ نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ کوچ گاڑی سیدھی سیدھی ناہوار سڑک پر بھاگی جاری تھی اور پھر کوچ گاڑی میں جتے ہوئے گھوڑوں میں ایک گھوڑا احتجاجاً ہنسیا کوچان نے کچھ بڑبڑا کر اور کچھ پچکار کر گھوڑے کی حوصلہ افزائی کی، دوسری ہلکی سی ہنسیا ہٹ سٹائی دی اور پھر چڑھاتے اور کھڑکھڑاتے ہوئے پیسوں کی رفتار کم ہو گئی مسلسل ٹاپوں کی آواز غیر مسلسل ہو گئی اور پھر کوچ گاڑی اچانک رک گئی۔

اور چاروں مسافروں کے دل دھڑکنے لگے اور مختلف قسم کے خیالات ان کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔

”کیا ہوا؟“

”کیا ہم راستہ بھول گئے؟“

”ہم کہاں پہنچ گئے ہیں؟“

”میرے خدا! اب کیا ہو گا؟ اس دیرانے اور اندھیری رات میں ہم کہاں جائیں گے؟“

لیکن کچھ نہ ہوا تھا۔ وہ راستہ نہ بھولے تھے اور نہ ہی انہیں کہیں جانے کی ضرورت تھی، کیونکہ وہ پہلی منزل تک پہنچ چکے تھے۔ سامنے سرائے تھی۔ کوچان اپنی نشست سے اتر کر نیچے آگیا تھا اور سرائے کا مالک تاک چندی اینٹوں کے صحن کو

اور روشن کمروں کی آزد میں بے تاب و بے قرار ہونے لگے تھے۔ وہ اس خاموشی سے آٹا کے ہوٹل کی بھیڑ بھاڑ آوازوں اور قہقروں اور کھانسی کو تلاش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جانتے تھے کہ گاڑی انہیں جس سرائے کی طرف لئے جارہی تھی اور جہاں انہیں قیام کرنا تھا وہی آٹا کے اس ہوٹل کے درجہ کا تو یقیناً نہ ہو گا جہاں ان چاروں نے قیام کیا تھا اور جہاں سے وہ آ رہے تھے۔

ان دور افتادہ اور تقریباً ویران علاقوں میں گھسنے کے بجائے اگر انہوں نے اپنی چھٹی کے بقیہ دن بھی چٹیلے اور جھلگاتے ہوئے وی آٹا گزار دئے ہوتے تو بہتر ہوتا لیکن چارلس ایک ہی منہلا اور ضدی تھا اور اس نے کہا تھا کہ اگر سیو تفریح کو چلے ہیں تو ان کی تفریح صرف سیر اور مڑمڑی تک محدود نہ رہنی چاہئے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس تفریح کو نہ صرف اور بھی زیادہ دلچسپ بلکہ یادگار بھی بنا دینا چاہئے اس نے کہا تھا کہ وہ چار ہیں اور چاروں ساتھ ہیں چنانچہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں چنانچہ کار ہتھما کی سنگلاخ بلندیوں کی چڑھائی بے حد دلچسپ سفید اور تقریباً سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ اور چارلس کے تین ساتھیوں نے اس کی ضد اور جھٹ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

اور اب وہ اتنی دور آچکے تھے کہ واپس لوٹ جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا چنانچہ اب انہیں نقشے اور راہنما کتاب پر بھروسہ کرنا تھا حالانکہ راستہ جو نقشے میں ہوا اور دلچسپ معلوم ہوا تھا حقیقت میں دشوار گزار اور تکلیف دہ تھا لیکن اب ظاہر ہے کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ راستہ کتنا ہی دشوار گزار اور سفر کتنا ہی کشن کیوں نہ ہو انہیں بہر حال اپنا یہ سفر جاری رکھنا تھا۔ چنانچہ اب تو یہ چاروں مسافر صرف یہی چاہتے تھے کہ جلد از جلد سفر کا یہ دور ختم ہو جائے تاکہ وہ اپنے گھٹکے ہوئے جسم اور درد کرتی ہوئی ہڈیوں کو بستر پر ڈال سکیں۔ اس کبوت سفر نے تو ان کی ہڈیاں ہلا ماری تھیں اور

ہاتھوں میں شراب کے لبریز جام تھے اور آتشان میں بھڑکتے ہوئے شعلے اور شراب ان کے سر اور تھکے ہوئے جسم میں خوشگوار گرمی پہنچا رہی تھی۔

چنانچہ وہ سستانے لگے۔ یعنی اس میں سے تین سستانے لگے البتہ چارلس کھسٹ کی رنگوں میں تو گویا پادہ بھرا ہوا تھا اور وہ زیادہ دیر تک مچلانا بیٹھ سکتا تھا یورپ کی سیاحت کے خیال کا چاچ اس کے دماغ میں پڑا تھا اور یہ تجویز اسی کی تھی چنانچہ اب وہ اس سفر کے ایک منٹ کو بھی ضائع کرنا نہ چاہتا تھا بلکہ وہ اس تفریح سے جس قدر لطف بھی حاصل کر سکتا تھا کر لیتا چاہتا تھا۔ اس کا شوق تجسس غیر تسکین پذیر تھا اور نئے نئے تجربات حاصل کرنے نئے مقامات دیکھنے اور مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے کا اسے ہو کا تھا۔ جب اس کے دوسرے ساتھی ان چوبی بیچوں پر بیٹھے سستارہے تھے جو آرام وہ تو نہ تھے۔ لیکن جو ڈگر ڈگر لہتے ہوئے بھی نہ تھے تو چارلس اپنی ناپختہ اور غلط جرمی ان نئے لوگوں پر آزاد رہا تھا۔ پہلے اس نے سرائے کے مالک پر اور پھر ان لوگوں پر آزمائی جو اپنی شام گزارنے کے لئے اس سرائے کے ایک کونے میں آ بیٹھے تھے۔ یہ لوگ بوے ہی کم گو معلوم ہوتے تھے ان میں سے چند مقامی زبان بولتے تھے۔ جس کا ایک لفظ بھی چارلس کے پلے نہ پڑتا تھا۔ دوسرے لوگ کچھ کچھ جرمن زبان جانتے تھے لیکن انکی زبان بھی چارلس کی جرمی کی طرح غلط سلا ٹوٹی پھوٹی اور بے ربط تھی۔ وہ چار ایسے تھے جو اجنبی لوگوں سے بات کرنا ہی نہ چاہتے تھے چنانچہ وہ ایک الگ گروہ بنائے آپس میں ہی بوے رازدارانہ انداز میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

چارلس نے ان لوگوں کو ایک دودھ اپنی طرف سے شراب پلائی تو انکی بے رخی پکھلنے لگی۔ اب وہ چارلس کی طرف دیکھ کے مسکرا رہے تھے۔ وہ چارلس کے ان سے باتیں کرنے کی کوشش پر سر ہلا رہے تھے اور جب ان کے سامنے چارلس کے خرچ

عبور کر کے دفعتاً "بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ کوچ گاڑی کا دروازہ کھول کر اپنے مہمانوں کو خوش آمدید کہے انسانوں کے بولنے اور دوڑ دھوپ کی خوشگوار آوازیں سنائی دیں بہت سی کھڑکیاں کھل گئیں اور ان کھلی ہوئی کھڑکیوں اور ایک کھلے ہوئے دروازے میں سے خوف دور کر دینے والی روشنی باہر ہمہ آئی علاقے کی ویرانی یکایک دور ہو گئی یا یوں کہو کہ اس ویران علاقے میں سفر کرنے کے بعد ہمارے یہ مسافر جیسے ایک دم سے سکون بخش نخلستان میں پہنچ گئے تھے جہاں ان کا استقبال کیا جا رہا تھا جہاں انہیں سردی اور اندھیرے سے پناہ مل سکتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ انہیں کھانا اور آرام بھی مل سکتا تھا۔

مسافروں کے لئے کمرے تیار تھے سرائے چھوٹی سی تھی اس کی چھت نیچی تھی اور فرنچر قدیم طرز کا اور پرانا تھا۔ لیکن سرائے کا مالک بے حد غلط معلوم ہوتا تھا اور ان دیوانے انگریزوں کی ہر خدمت کے لئے بلکہ ان کے قدموں میں بچھ جانے کے لئے تیار تھا۔ جو خدا جانے کیوں اتنی دور آئے تھے۔

گرم پانی کے جگ تیار کئے گئے۔ سرائے کے مالک نے سن رکھا تھا کہ انگریز سب سے پہلے نہانے کی رسم ادا کرتے اور بہت سا گرم پانی استعمال کرتے ہیں۔ مسافروں نے غسل کیا اور اپنے تھکے ہوئے جسموں کو ہنتر ڈال دیا اور جب تک انکی ٹکان دور ہو تب تک ان کے لئے کھانا نہ صرف تیار ہو چکا تھا بلکہ میز پر چٹا بھی جا چکا تھا۔

کھانا سادہ مگر لذیذ تھا اور وہ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر بوے سے آتشان کے قریب بیٹھ چکے تھے اور اسکی دھواں آلود روشنی اور گرمی میں سستارہے تھے آتشان میں لکڑیاں جلی رہی تھیں اور ان کے یہ چٹائے ہمارے مسافروں کو بوے ہی سامنے نواز معلوم ہو رہے تھے کیونکہ اب وہ رات بھر سو کر اپنی تھکن دور کر سکتے تھے۔ کیوں کہ اب وہ سرائے میں تھے۔ اور ان کے پیٹ بھر چکے تھے۔ اور ان کے

تھی پیسے کی اور کھیتوں کی مٹی کی بو اور ان دہائیوں سے پرے نیچی چھت کے نیچے
آئندہ ان کے قریب بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں کے چہرے چارلس کو درد اور حیرت
انگیز حد تک اجنبی اجنبی سے معلوم ہوئے۔

ہیلن کے ابو پر بل پڑ چکے تھے۔ چارلس کو اس پر تعجب نہ ہوا۔ کیونکہ ہیلن کو
یہ باتیں پسند نہ تھیں کہ انسان اپنا مقام بھول کر ان لوگوں میں جا بیٹھے جو اس کے
قدموں میں بیٹھنے کے قابل نہ ہوں۔ اور پسندیدگی کا اظہار کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔
چنانچہ وہ ابو پر بل ڈال کر چارلس کی ان بے کلفیوں پر ناراضگی ظاہر کر رہی تھی۔
رہا چارلس کا بڑا بھائی ایلن تو وہ ہر چند کہ اپنے بھائی کی طرف لال لال آنکھوں
سے تو نہ دیکھ رہا تھا تاہم چونکہ بیٹھا تھا کہ خدا جائے کیا ہو۔

چارلس کو اب بھی یقین نہ آتا تھا کہ وہ اپنے بھائی ایلن اور اس کی بیوی ہیلن کو
اپنے ساتھ اس سفر پر لانے میں کامیاب ہو گیا تھا ایلن پیسے کجس نہ تھا۔ لیکن فطرتاً
محتاج ضرور تھا۔ دونوں بھائیوں کو باپ کی موت کے بعد ایک چھوٹا سا ورثہ ملا تھا۔ اور
جب چارلس اپنے حصے کو زندگی کی سرتمیں حاصل کرنے کے لئے خرچ کر رہا تھا۔۔۔۔۔
فضول خرچی سے نہیں بلکہ ایک حد تک کفایت شعاری سے۔۔۔۔۔ تو ایلن اپنے حصے کو
منفید کاروبار میں لگا رہا تھا۔ خرچ اور آمدنی کا حساب ہر شام ہوتا اور ایلن جذبات کی رو
میں بہہ کر یا جوش میں آکر اپنی مٹھی نہ کھول دیتا۔ بلکہ ایک ایک دھڑی چند ٹانہوں
تک سوچنے کے بعد خرچ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہر قسم کے سیاسی اور غیر سیاسی
ہنگاموں سے دور ہی دور رہتا۔ اور کسی بھی بڑے اور چھوٹے خطرے کو سامنے دیکھتا تو
کئی کترا جاتا تھا۔ اس حد سے بڑھی ہوئی احتیاط اور اپنے تلے پن کا اثر اس کے لب و
لہجہ پر بھی ہوا تھا چنانچہ اس کی آواز میں ایک قسم کا اکڑپن آگیا تھا۔ لیکن خود چارلس
اپنے بھائی کے اس اکڑپن میں چھپے ہوئے خلوص اور محبت سے واقف تھا۔

سے شراب کے لبالب پیالے رکھے جارہے تھے تو ان کی باچیں پھٹی جارہی تھیں۔
اور جب سرائے کے مالک نے کلاؤن پر ایک بڑی سی مٹل جڑی کشتی رکھ کے چارلس
کو ”تھری ڈائس“ کھیلنے کی دعوت دی تو ان نے سمجھ لیا کہ اسے اس سرائے میں قبول
کیا جا چکا تھا اور یہ کہ لوگوں کی اجنبیت دور ہو چکی تھی کچھ دیر تک سرائے کا مالک
اسے اس کھیل کے قواعد و ضوابط سمجھاتا رہا۔ چارلس کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا تاہم
اس نے بڑے یقین سے سر ہلادیا۔ اور وہ ڈائس کھانے لگا۔ وہ سرائے کے مالک اور
اس معمر شخص کے سامنے کھیل رہا تھا۔ جس کی نگاہیں کھوتے ہوئے ڈائس پر کے
سفید چمکدار ہندسوں پر سے کسی صورت ہٹتی نہ تھی۔
دوسرے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔

ابتداء میں وہ دبی دبی ہنسی ہنستے رہے جیسے شراب ہے ہوں۔ جیسے اگر زور سے ہنسنے تو
بد اخلاقی ہوگی لیکن رفتہ رفتہ یہی شرمیلی ہنسی قہقہوں میں تبدیل ہو گئی۔ پاپ اور
سلاکے گئے اور سرائے کی فضا دیکھتے ہی دیکھتے دھواں دھار ہو گئی۔ کمرہ اور زیادہ گرم
ہو گیا۔ شور شرابا اور بڑھ گیا۔

چارلس نے پانے پھینکے اور جیت گیا۔ پھر پھینکے اور پھر جیتا۔

لوگ بڑھانے اور ہارنے والے منہ بنانا کے کراہنے لگتے چارلس نے شراب
لانے کا حکم دیا اور بنے ہوئے منہ پھیل کے مسکرا اٹھے اور بڑھاپٹ بھی اطمینان اور
خوشی کی سرگوشیوں میں تبدیل ہو گئی۔

اس پھاڑی علاقے کے جنگلوں اور کھیتوں اور چراگاہوں میں دن بھر مشقت
کرتے اور عناصر کا مقابلہ کرتے ہوئے سادہ لوگوں کے جھروں پڑے، دھاڑیں پڑے،
چکے اور جھلسی ہوئی رنگت والے چہرے آگے کی طرف جھک گئے، قریب آگے اور
چارلس کی نشتوں وہ بو پھٹی۔ جو ان بے نمائے ہوئے مگر قوی جسموں سے اٹھ رہی

کی۔ اور اپنے ساتھیوں کی طرف پڑھا۔

”واہ بڑے حاتم ہو تم۔“ ہیلن نے چارلس کی طرف دیکھ کر اور بھونکیں اچکا کر کہا۔

لیکن ڈانکا مسکرا رہی تھی۔ ہیلن کی زبان ٹیکسی تھی تو ڈانکا کی بے حد شیریں۔ ہیلن کے منہ سے ہمیشہ اور طنز جملے نکلا کرتے تھے لیکن ڈانکا کی ہر بات دل کو خوش کرنے والی اور حوصلہ افزاء ہوتی تھی، ہیلن بے آب و گیاہ صحرا کے پتے ہوئے تکلیف دہ ریت کی طرح تھی ڈانکا۔ وہ ٹھنکتان تھی جہاں چارلس کو سکون، فرحت اور مسرت حاصل ہوتی تھی ڈانکا کے صرف ہونٹ ہی نہیں آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں وہ اپنے شوہر کی ہر سمجھ و غلط حرکت کو تفریق نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن ہیلن کی آنکھوں سے غصہ عیاں تھا۔ جیسے وہ جھگڑ پڑنے کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ چارلس کو اپنی بیوی کی جلد بہت پسند تھی۔ نرم اور چکنی اور وہ اپنا جسم ہر دفعہ پہلی رات کے سے جوش، شوق محبت و خلوص سے چارلس کے حوالے کر دیتی تھی۔ اور ہیلن۔۔۔ خیر! یہ تو کسی طرح چارلس کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ ایلن اور ہیلن کبھی ایک دوسرے سے جسمانی لذت حاصل بھی کرتے ہوں گے۔ ایسے خشک مزاج لوگوں کے لئے، جن کی زندگی کا پہلا اور آخری مقصد روپیہ بچانا ہو کسی بھی قسم کی لذت کوئی معنی نہیں رکھتی اور زندگی کی آسائشیں انہیں خواہ خواہ کے چھٹلے معلوم ہوتے ہیں۔

ڈانکا نے بڑی صفا، پیار اور پیارے کی طرح اپنا پیالہ چارلس کی طرف پڑھا دیا۔ اور موخرالز کرنے مزاجی جھکا کر اسے لبالب بھر دیا۔ صراحی اور پیالے کے لب ایک طویل پوسے کے بعد علیحدہ ہوئے تو چارلس ہیلن کی طرف گھوم گیا۔ لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”بہت زیادہ خرچ کرتے ہو تم“ وہ بولی ”آخر حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ ایسا بھی

رہی چارلس کی بھابی ہیلن تو اسے ایلن کی بیوی بنے سات یا آٹھ سال ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ اب بھی بڑی عمر کی کنواری یعنی غیر شادی شدہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی عمر تیس برس سے تجاوز کر چکی تھی اور وہ ہر طرف اور وہ پہلو سے خاص قبول صورت تھی، لیکن خدا جانے کیوں وہ اپنے بالوں کو پیچھے کی طرف بڑے ظالمانہ انداز سے کھینچ کر ان کا جوڑا باندھتی تھی اور اس وجہ سے اس کا چہرہ سٹا ہوا اور وہ خود معمر معلوم ہوتی تھی اس کے ہونٹ ویسے ہی پتلے تھے۔ پھر ہیلن کی یہ بری عادت تھی کہ وہ انہیں ناپسندیدگی سے اپنے دانتوں میں کھینچ دیا کرتی یا یوں کہنے کہ انہیں چوسا کرتی تھی۔ چنانچہ وہ اور بھی پتلے معلوم ہوتے تھے۔ ہیلن کے خیالات اپنے شوہر کے خیالات سے مختلف نہ تھے چنانچہ وہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی کفایت شعاری کی تعریف کر کے اسے اور بھی کفایت شعار بنا رہی تھی۔ اور اس نے اپنی زندگی کے لئے جن سخت اصولوں کی تنظیم کی تھی۔ ہیلن اسے بھی ہوا دیتی تھی۔ چنانچہ جب چارلس اور اس کی بیوی ڈانکا نے اس سے کہا کہ وہ اور ایلن بھی ان کے ساتھ سفر کو چلے چلیں تو ہیلن نے انکار کر دیا۔ لیکن خدا جانے کیا بات ہوئی کہ زندگی میں پہلی دفعہ ایلن نے اپنی بیوی کی مخالفت کی اور اپنی زندگی کی مخصوص ڈگر سے ہٹ کر وہ چارلس اور ڈانکا کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ چنانچہ ہیلن بھی تیار ہو گئی اور اس وقت ہیلن اور ایلن کار ہتھما کے ایک دور افتادہ اور انجان خطے کے ایک چھوٹی اور سستی سرائے میں آٹھ ان کے قریب ڈانکا کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور یہ واقعی حیرت انگیز لوگ ناقابل یقین سی بات تھی۔

اور اب چارلس کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ نئے نئے دوست بنانے اور انہیں شراب پلانے کی خوشی میں وہ اپنے مسافروں کو اور ان کے خالی پیالوں کو بھول ہی گیا تھا۔ چنانچہ اس نے جلدی سے پتھر کی بھری ہوئی صراحی سرائے کے مالک سے حاصل

وہ لوگ نصف فاصلہ طے کر کے کمرے کے بیچ میں پہنچے تھے کہ دفعتاً "بڑے زور سے سرائے کا دروازہ کھلا اور رات کی تیز اور سرد ہوا کا ایک جھکڑ اندر دھنس آیا اور شمرے میں چھایا ہوا آتش ان کی لکڑیوں اور سگریٹوں کا دھواں جھکڑ کے اس فوری ہلے کی تاب نہ لا کر ایک دم سے چمت کی طرف اٹھا ایک چوڑے شانوں والا طویل انعامت فحش دروازے میں کھڑا ہوا تھا اس نے راہبوں کا لباس پہن رکھا تھا اور وہ دروازے میں کھڑا گاؤں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس ملائمت کے برخلاف جو راہبوں سے مخصوص ہے اس فحش کے بشرے سے کرنٹلی اور آنکھوں سے حقارت عیاں تھی گویا وہ ان لوگوں کو جو اس وقت سرائے میں موجود تھے، ذلیل سمجھ رہا ہے اس نے ایک ٹانگ سے ٹھوکر مار کر دھڑ سے دروازہ بند کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سرائے کے ایک کی طرف بڑھا۔



کیا کہ آدمی آگے پیچھے کا خیال ہی نہ کرے، اور تم جانو یہ لوگ بھی، جنہیں تم اتنی بہت سی شراب پلا رہے ہو تمہاری اس۔۔۔ کیا کہتے ہیں۔۔۔ سخاوت کو پسند نہیں کرتے۔ اور اس نے ایک بار پھر سر ہلا کر سرائے کے پورے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ لوگ تمہیں بیوقوف سمجھتے ہیں۔"

"میں جو کچھ کرتا ہوں خود اپنی تسکین اور اپنے غم کے لئے کرتا ہوں۔ یعنی کسی اور کے لئے نہیں۔" چارلس نے بڑی رکھائی سے کہا اور ایلن کی طرف گھوم کر پوچھا۔ "کیوں بھی؟" آپ کو میری بے محل سخاوت ناپسند ہے؟" ایلن مسکرایا۔

"چارلس! تمہاری کسی بھی حرکت اور کسی بھی کام پر پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا فتویٰ صادر کرنے کی عادت میں ایک عرصے سے ترک کر چکا ہوں" وہ بولا۔ "حماقت بہر حال حماقت ہے۔" ایلن نے کہا۔

ڈانٹا نے ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور مسکرا کر چارلس کی طرف دیکھا۔ یہ ان دونوں کی مخصوص مسکراہٹ تھی، خفیہ، محبت سے بھرپور اور پر معنی۔ اس مسکراہٹ کو صرف چارلس سمجھ سکتا تھا۔

"میرے خیال میں اب ہمیں سونا چاہئے چکر" ڈانٹا نے کہا "کیونکہ صبح سب کو جلد اٹھنا ہے۔"

"کیا لاشی کوچ گاڑی ہے وہ بھی جس میں ہم سفر کر رہے ہیں۔ میرا تو ایک ایک جوڑو درد کر رہا ہے۔" ایلن نے کہا اور اس خوف سے وہ اٹھ کھڑی ہوئی کہ کہیں یہ لوگ اپنا خیال نہ بدل دیں "اس گاڑی میں دوبارہ سوار ہونے سے پہلے کم از کم میں تو لمبی تان کے سونا چاہتی ہوں۔"

میں بھونک دیا۔

سرائے کے مالک نے جلدی سے ایک بوڑھے شخص کی طرف دیکھا، پھر دوسری طرف اور پھر راہب کی طرف دیکھا۔

”قادر شیشدور۔۔۔“ اس نے کتنا شروع کیا

”خدا جانے کیا گویہ بھرا ہے، تمہاری موتی کھوپڑیوں میں“ راہب جس کا نام شیشدور تھا کرجا۔ ”کہ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟ وہ معاملہ ختم ہوا۔۔۔ وہ عفریت نہیں رہا۔۔۔ اس کے خاتمہ کو ایک نہ دو پورے دس برس ہو چکے۔“

سرائے کا یہ کمرہ جو چند منٹ پہلے خوشی کی آوازوں اور قہقروں سے گونج رہا تھا۔ اب قبر کی طرح خاموش تھا۔ وہاں موجود ہر شخص کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں، وہاں موجود ہر شخص کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ہر شخص سانس روکے کھڑا تھا۔

”آج رات“ قادر شیشدور غصے میں چیخا ”آج ہی رات کو میں نے ایک بچی کی لاش کو مسخ ہونے سے بچایا ہے، بڑی وحشیانہ پن ہے یہ تو وہ لوگ اس لاش کے سینہ میں کھونٹا ٹھونکنے جا رہے تھے کہ اتفاقاً میں وہاں پہنچ گیا اور میں نے سختی سے اور جبراً انہیں لاش کی بے حرمتی کرنے سے روک دیا۔ کس قدر جاہل ہو تم لوگ۔ اور جب یہ کارروائی کی جارہی تھی تو ایک پادری بھی وہاں موجود تھا۔ اس کبیرت کی اجازت سے ہی اس بچی کی لاش کے سینے میں کھونٹا ٹھونکا جا رہا تھا۔ یہ انتہا ہے کیا تم لوگ کبھی اپنے آپ کو اس بیجا خوف اور وہم سے آزاد نہ کر سکو گے؟ وہ عفریت اب نہیں رہا۔ اس کے خاتمے کو دس برس کا عرصہ گزر گیا۔ یو قوفوں۔“

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سب کے سب نظریں جھکائے خاموش کھڑے

چنانچہ قادر شیشدور غرا کر اور دانت پیس کر آشدان کے اور بھی قریب ہو گیا اور

”شکر اور گرم مصالحہ ڈال کر میرے لئے عمدہ سرخ شراب کی بوتل لے آؤ یا ہر موسم اس قدر خراب ہے کہ کوئی جانور بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ بولا۔

سرائے کے مالک کو یہ حکم دیکر وہ آشدان کی طرف گھوم گیا اور چمت کی ایک شہتیر سے فلی ہوئی کسی چیز سے اس کا سر نکلایا یہ لسن کے غنچوں کا ایک گلدستہ سا تھا۔ جو شہتیر سے بندھی ہوئی ایک رسی کے دوسرے سرے سے بندھا لنگ رہا تھا۔ راہب نے غصے کی ایک غراہٹ کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر وہ گلدستہ گھسیٹ لیا۔ اور بڑے غصہ کے عالم میں اسے فرش پر دے مارا۔

”ہم! اس عفریت کو دور کرنے کے لئے یہ لسن؟“ وہ بولا۔ ”میں کتا ہوں اب وہ عفریت نہیں رہا۔ اور اگر ہے تو پھر یہ تمہارا ٹونکا اسے روک نہیں سکے گا۔“

اس نے جھک کر لسن کے غنچوں کا گلدستہ فرش پر سے اٹھایا اور اسے آشدان

”ہاں بیٹے۔ سنجیدگی سے حاصل کرتا یا حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“
فادر شینڈور نے کہا۔

”حالانکہ آپ راہب ہیں؟“ چارلس نے کہا۔

”ہاں۔ حالانکہ میں راہب ہوں لیکن تارک الدنیا نہیں ہوں کہ زندگی کی آسائشوں سے اپنے آپ کو الگ کر لوں۔“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”سنو صاحبزادے! اس فانی دنیا میں جتنی بھی سرسٹیں حاصل کر سکتے ہو کرلو کیونکہ دوسری دنیا کا تو یہ ہے کہ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ یعنی وہاں اس دنیا کی سرسٹیں کہاں حاصل ہو گئی؟ یا پھر بہت کم ہوں گی۔“

ہیلن نے فادر شینڈور کے اس کفر پر دہی زبان میں اعتراض کیا تو فادر کا سر آہستہ سے اس کی طرف گھوم گیا۔

”بائو! کیا امکان ہو گا وہاں؟ ایس کیسا ہو گا؟ دوزخ؟ اس کا ایندھن اور اس کے شعلے یا۔۔۔“ اور اس نے اپنی گھنی بھونٹیں اچکا کر نگاہیں جھٹ کی طرف اٹھا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں آتش دان کے سامنے اپنی دم گرم کرنے اور اس وقت سرائے کا مالک شراب لیکر آیا تو فادر شینڈور نے اپنا مضبوط بازو اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”اور مصالحہ دار شراب پینے کی سہولت تو میسر نہ ہوگی۔ یہ تو عارضی چیزیں ہیں۔ اور ہم ان سے اسی دنیا میں لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ وہاں نہ تو چوڑے ٹھنڈے پڑ جائیں گے کہ انہیں گرم کیا جاسکے اور نہ سرد ہوائیں چلیں گی کہ مصالحہ دار شراب سے لطف اندوز ہوا جاسکے۔ ہاں تو کیا اب میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ چار خوش باش انگریز کارہتھما میں کیا کرتے تشریف لائے ہیں؟“

چنانچہ چارلس نے پہلے رسم تعارف ادا کی۔ پہلے اس نے اپنا پھر اپنی بیوی ڈانٹا، اپنے بھائی ہالین اور اپنی بھابی ہیلن کا تعارف کرایا۔ فادر شینڈور ہر ایک کے سامنے

اب پہلی دفعہ اسے اس سرائے میں چار اجنبیوں کی موجودگی کا احساس ہوا ایک لمبے تھکاوہ بڑی ناقدانہ نگاہوں سے ان کا جائزہ لیتا رہا۔ اور پھر اس کے بشرے کی کرختگی و فقہا، ملائمت میں اور تند خوئی بشارت میں تبدیل ہو گئی وہ ڈانٹا کے سامنے بڑے اخلاق سے جھک گیا اور موثر الذکر جواب میں مسکرا دی، اب فادر شینڈور ہیلن کی طرف گھوم گیا۔ وہ بدستور ماتھے پر پل ڈالے اور ہونٹ پیچھے خاموش کھڑی رہی۔

”ہا۔ آ۔“ فادر شینڈور کمرے کی طرف منہ اور آتش دان کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ اپنا چہرہ ایک جھٹکے کے ساتھ اوپر اٹھایا اور اپنے کونٹھے سینکے کے بعد بولا۔ ”اب کچھ سکون ملا۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ کونٹھوں کو گرم کرنے کا سامان یہاں موجود ہے ورنہ وہ تو برف کے تودے ہی بن گئے تھے۔“

”بڑا ہی دیدہ دلیر اور منہ پٹ قسم کا مگر کافی مضبوط شخص ہے۔“ چارلس نے سوچا۔ راہب ہوتے ہوئے ہمدرد اور دلیر ہے اور ان لوگوں میں سے ہے جو بے جھجک اور تن تنها دنیا کا اور ہر خطرے کا مقابلہ کر لیتے ہیں۔ اور وہ بھی خوف زدہ نہیں ہوتے اور پھر یہ ان لوگوں میں سے بھی ہے جو بے دھڑک بیان کر دیتے ہیں اور سامنے والے سے نہیں ڈرتے اور نہ ہی اس کے جذبات کا خیال کرتے ہیں کیونکہ حقیقت، ہر حال حقیقت ہوتی ہے خواہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ قابل تعریف اور پر قوت شخص ہے یہ فادر شینڈور لیکن اس کا قرب خواہ مخواہ انسان کو بے چین کر دیتا ہے۔

”واہ! میرے لئے زندگی کی صرف چند ہی سرسٹیں باقی رہ گئی ہیں۔ اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ بے حد لطف آ رہا ہے۔“ فادر شینڈور نے اپنا کونٹھوں پر ہاتھ ہارا۔ ”فادرا! چارلس نے پوچھا۔ ”کیا واقعی آپ زندگی کی سرسٹیں سنجیدگی سے حاصل کرتے ہیں یا محض زبانی جمع فوج ہے؟“

بڑی شائستگی سے جھک گیا۔ شراب کی ایک چسکی لی، غالباً معائنہ ٹھیک سے حل نہ ہوا تھا چنانچہ پیالے کو دو چار جھکولے دیئے اور پھر بولا۔
 ”اور مجھے فادر شینڈور کہتے ہیں کیلن برگ کی راہبوں کی خانقاہ کا صدر یعنی ایبوت ہوں۔“

اور چارلس نے دماغ پر زور دے کر اس نقشے کی تصویر بنائی۔ جسے وہ لوگ اس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اور اس پورے سفر میں بھی دیکھتے رہے تھے لیکن اسے یاد نہ آیا کہ اس نے یہ نام اس نقشے میں کسی جگہ نہ دیکھا تھا۔
 ”کیلن برگ! کہیں قریب ہی ہے یہ جگہ؟“ اس نے پوچھا۔
 ”نہیں۔ کافی دور ہے یہاں سے۔“ فادر شینڈور نے اپنا سر شراب کے پیالے پر جھکا کر اس کی بھاپ زور سے ناک میں کھینچی اور پوچھا ”کہاں سفر کو چلے ہو؟“

”جی نہیں کچھ پہاڑ پر چڑھیں گے اور کچھ میر کریں گے۔“ چارلس نے جواب دیا۔
 ”سفر وسیلہ ظفر ہے۔۔۔ کم سے کم ہم نے تو یہی سنا ہے۔ سفر سے آدمی کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی لوگ ایسا ہی کہتے ہیں۔“

”بہت خوب۔ لیکن تم جس علاقے میں سفر پر چلے ہو اس سے تمہیں کیا قائد ہوگا؟ ان دیرانوں میں تم کہاں وسیلہ ظفر تلاش کرو گے اور یہ جاہل لوگ تمہارے علم میں کیا اضافہ کریں گے؟“

اور فادر شینڈور نے سرائے میں بیٹھے اور کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

”اپنے مریدوں کے متعلق آپ کے خیالات کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔“
 ”یہ میرے مرید نہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں انہیں برداشت بھی نہیں کر سکتا۔ ان کی صورتوں تک سے بے زار ہوں۔ اور پھر یہ لوگ میرے ماتحت نہیں ہیں۔ اور

میں ان کی خبر گیری نہیں کرتا۔ اور یہ ان لوگوں کی بد قسمتی ہے وہاں کیلن برگ میں تمہیں ایسے تو ہم پرست، جاہل اور رجعت پسند لوگ نہ ملیں گے، میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں آجاؤ۔ خانقاہ میں قیام کر سکتے ہو۔ خانقاہ کے برادر تمہاری خاطر ودارات میں کوئی کمر اٹھانہ رکھیں گے۔“

فادر شینڈور کی اس دعوت نے چارلس کا دل موہ لیا۔ بے حد دلچسپ تجربہ ہو گا۔ یہ اور انوکھا بھی اور پھر چارلس کو یہ بھی احساس ہوا تھا کہ خود شینڈور بے حد دلچسپ اور رنگارنگ قسم کا آدمی ہے۔ چنانچہ کیلن برگ کی خانقاہ میں ان کا قیام یادگار رہے گا۔ فادر شینڈور نے اپنی باتوں سے ایک نئی اور نرالی دنیا کے دروازے ان کے لئے کھول دے گا۔

چنانچہ چارلس نے کہا۔ ”خیال تو بے حد عمدہ۔۔۔۔۔“
 ”ہم فادر کی یہ دعوت نہیں قبول کر سکتے“ ہیلن نے سختی سے کہا۔
 ”کیوں؟“ چارلس نے پوچھا۔

”اس لئے کہ ہمارا پروگرام جو پہلے سے بن چکا ہے ہمیں اس راستے سے ادھر ادھر ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔“

”اب بھئی، ایسی بھی بے مروتی کیا۔“ چارلس نے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ پروگرام سے ذرا سا انحراف۔“

”چارلس! تم پاگل ہو گئے ہو۔“ ہیلن نے کہا۔
 ”اس میں پاگل ہونے کی کیا بات ہے بھائی۔ دراصل۔۔۔۔۔“

”دراصل یہ کہ“ ہیلن نے فیصلہ کن انداز میں کہا ”کل ہم جوزف باد کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔“

یہ نام سنتے ہی فادر شینڈور چونکا۔

”کیا کما تم نے کہ کہاں جا رہے ہو؟ تم لوگ“ اس نے پوچھا۔

”جوزف باد۔“

”ہم۔ مناسب ہوگا۔ کہ تم اپنا راستہ بدل دو۔“ اس نے بڑی سخت آواز میں کہا۔

اور اس کا لہجہ ایسا تھکانہ اور اس کا حکم ایسا خلاف توقع تھا کہ ہیلن گھبرا کر اختیار کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اگر کسی نے اس کے گل پر اچانک چائنا رسید کر ہوتا۔ تب بھی وہ اتنی نہ بوکھلائی، الین ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ ایسے موقع پر وہ اپنی بڑی کی مدد کو دوڑ آتا تھا۔

”قادر! آپ کی دعوت کا شکریہ“ الین نے کہا ”بیک ہم اسے قبول کر لیتے، مگر افسوس ہے ہم روانہ ہونے سے پہلے مکمل پروگرام بنا چکے تھے اور اب اسے تبدیل کرنا خلاف عقل۔۔۔۔۔“

”اسے تبدیل کرنا نہیں بلکہ اس سے چپکے رہنا خلاف عقل ہے۔“ قادر شینڈور نے کہا۔ ”میں تم کو کیلن برگ آنے پر مجبور نہیں کرتا یہ تمہارا معاملہ ہے۔ اور تم اپنی مرضی کی مالک ہو، جی چاہے وہاں آؤ اور جی چاہے تو کہیں اور چلے جاؤ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جوزف باد نہ جاؤ۔“

”ہم نے سنا ہے کہ بے حد خوبصورت جگہ ہے وہ“ ڈانکا نے کہا۔

”ہاں ہاں۔ لیکن بلائیں اور آئیں بھی خوبصورت ہیں“ قادر شینڈور نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ ڈانکا نے پوچھا۔

”۱۔ لروپا۔ بلا دو نا۔“ قادر شینڈور بڑبڑایا۔

”۲۔ لروپا۔ بلا دو نا! وہ کیا ہوتا ہے الین؟“ ہیلن نے سرگوشی میں پوچھا۔

”اس کے لفظی معنی تو ہیں رات کا مہیب جان لیوا سایہ، لیکن اس سے پادری کی

کیا مراد ہے، یہ میں نہیں جانتا۔“ الین نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

”میری ماں اور جوزف باد جانے کے ارادے ترک کر دو۔“ قادر شینڈور نے کہا۔

”لیکن قادر شینڈور! ہم لوگ اناڑی نہیں بلکہ تجربہ کار چڑھنے والے ہیں۔“

چارلس نے اسے یقین دلایا۔

”بیٹے! پہاڑ پر چڑھنے اترنے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے تم مجھے ایک سکی پادری سمجھ رہے ہو گے اور یہ بھی خیال کر رہے ہو گے کہ میں اپنے راہبوں کے لباس تک کا خیال نہیں کرتا اور یہ تمہارا خیال ایک حد تک صحیح بھی ہے لیکن میاں! میں چاہوں تو سنجیدہ بھی بن سکتا ہوں اور اس وقت میں سنجیدہ ہی ہوں مناسب ہوگا کہ تم لوگ جوزف باد سے دور ہی دور رہو۔“

”کیوں؟“

”اگر میں نے تمہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا تو شاید بلکہ یقیناً تم اس پر یقین نہ کرو گے یہاں تک تو خیر ٹھیک ہے لیکن شاید یہ ہوگا کہ سب کچھ سن لینے کے بعد تم اسے ایک چیخ یقین کرتے ہوئے وہاں جانے کے لئے بے چین ہو جاؤ گے اور اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔ اس سرائے میں موجود کسی بھی شخص کے سامنے تم جوزف باد کا نام لو اور تم دیکھو گے کہ وہ خزاں رسیدہ بچے کی طرح کانپ رہا ہے۔ یہ لوگ ایک ناقص راکٹ میں بیٹھ کر چاند پر جانے کے لئے تیار ہو جائیں گے لیکن جوزف باد کبھی نہ جائیں گے اور ان لوگوں کو دو سرے لوگ کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، جو جوزف باد کے آس پاس رہتے ہیں۔“

”لیکن کیوں؟“

”بس یہ نہ پوچھو۔ البتہ اتنا ضرور سن لو کہ کوئی تمہاری مدد نہ کرے گا کوئی تمہیں دش آئید نہ کہے گا اور اگر خدا نخواستہ کچھ ہوا تو بہت برا ہوگا۔“

کیا ہے۔

چارلس جانتا تھا کہ یہ ایلن نے غلط نہ کہا تھا اس نے بڑی تفصیل اور باریک بینی سے اس نقشہ کا مطالعہ کیا تھا اور ایک ایک راستہ ایک مقام اور ایک ایک عمارت جو نقشے میں بتائی گئی ہے اس کے ذہن میں محفوظ ہے۔

”نقشے میں نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ قعر سرے سے ہی نہیں“ شینڈور نے کہا۔ بہر حال اس قعر کے قریب نہ جانا اور اس نے جھک کر پہلے دونوں عورتوں کو اور پھر دونوں مردوں کو سلام کیا اور پلٹ کر دروازے کی طرف چل دیا دروازے کے قریب چند لوگ کھڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے شینڈور کو آتا دیکھ کر وہ اسے راستہ دینے کے لئے دائیں بائیں ہٹ گئے۔

قادر شینڈور نے یوں جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھولا جیسے کواڑ کو چلوں سمیت اکھاڑ کر پھینک دے گا۔ وہ باہر نکل گیا اور دروازہ یوں دھڑ سے بند کیا گیا کہ کواڑوں کا نہ صرف چوکھٹا بلکہ چھت کے شہتیر بھی بل گئے کچھ ہی دیر بعد گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی جو دور ہونے لگی دور ہو کر دم ہونے لگی۔ اور پھر خاموشی میں تحلیل ہو کر عائب ہو گئی۔

سرائے میں سکون اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہاں موجود ہر شخص نے جیسے خطرہ ٹل جانے کے بعد اطمینان کا سانس لیا ہو لوگوں کے ہونٹ ہلے اور خاموشی کمرہ رفتہ رفتہ ایک بار پھر آوازیں سے پر ہو گیا سرائے کا مالک صراخیاں اور خالی پیالے سینے لگ

”لینڈ لارڈ! ایلن نے سرائے کے مالک سے پوچھا قادر شینڈور نے ایک قعر کے متعلق کچھ کہا تھا تم جانتے ہو کہ یہ قعر کیسا ہے اور کہاں ہے؟“

سرائے کے مالک نے چونک کر نکلیوں سے ایلن کی طرف دیکھا۔

”اس علاقہ میں اور بھی بہت سے حسین مقامات ہیں۔ ان کی سیر کرو اور لطف اٹھاؤ۔ لیکن اس مقام کے قریب تک نہ جاؤ۔“

”جیسا کہ آپ نے کہا قادر۔“ چارلس بولا۔ ”یہ ہمارے لئے ایک چیلنج ہی ہے۔“

قادر شینڈور زخمی شیر کی طرح غرایا اس کی آنکھوں سے شدید غصہ مٹا ہوا تھا اور اس نے خالی پیالوں اٹھایا۔ جیسے اسے بڑے زور سے سامنے کی دیوار پر دے مارا۔ لیکن پھر چیخا۔

”لینڈ لارڈ۔“

سرائے کا مالک دوڑا آیا اور اس نے قادر شینڈور کے ہاتھ سے پیالے لے لیا۔

”تمہارے سرائے کے اصطبل کے محافظ کے پاس میں اپنا گھوڑا چھوڑ کر آیا ہوں۔“ قادر شینڈور نے بڑی شاہانہ شان سے کہا۔ ”اس سے کہو کہ میرا گھوڑا دروازہ پر لے آئے۔“

سرائے کا مالک اس حکم کی تعمیل کے لئے روانہ ہو گیا تو قادر شینڈور پھر انگریز مسافروں کی طرح گھوم گیا۔

”تم لوگوں سے مل کر مجھے خوشی حاصل ہوئی ہے خدا تمہیں حفظ و امان میں رکھے“ کاش کے تم لوگوں نے میرے مشورے پر عمل کر کے جوزف باد جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہوتا۔“ اور اس نے اپنے چوڑے کندھے اچکائے لیکن اگر تم میرے مشورے پر عمل نہیں کر رہے ہو تو نہ سہی جاؤ۔ لیکن خدا را قعر سے دور ہی رہنا۔ بھولے سے بھی اس کے قریب نہ جانا۔“

”قعر! ایلن نے کہا۔ ”کون سا قعر؟ نقشے میں تو کوئی قعر نہیں ہے؟“ اگر ہو تو میری نظر سے پوشیدہ نہ رہتا کیونکہ آپ جانتے ہیں نے بڑے غور سے اس کا مطالعہ

کڑی تھی کہ وہ آجائے تو دونوں اپنے کمرے کی طرف چل دیں
”ہم کیا؟“ ہیلن نے تیز نظروں سے چارلس کی طرف دیکھا۔

”ہم یہ بھائی کہ اگر۔۔۔ اگر۔۔۔ واقعی وہ قمر موجود ہے جس کا ذکر شینڈور نے
کیا ہے اور اگر وہ ہمارے راستہ میں ہی پڑتا ہے یا اگر راستہ سے بہت زیادہ ہٹ کر
نہیں ہے تو گئے ہاتھوں اس کی بھی سیر کر لی جائے“ آدھا ایک گھنٹہ ادھر ادھر ہو بھی گیا
تو اس سے کچھ زیادہ فرق نہ پڑنے کا ایک تاریخی قمر ہی ہم دیکھ لیں گے اور کیا۔



”قمر؟“ وہ بولا۔

”ہاں جوزف باؤ کے قریب ہے کہیں۔“

سرائے کے مالک کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ بے چین اور خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔
”میں کسی قمر سے واقف نہیں ہوں۔“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب

دیا۔

صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا سرائے کا مالک یقیناً اس قمر سے جس کا
ذکر شینڈور نے کیا تھا۔ واقف تھا لیکن وہ اس کے متعلق کچھ کہتا تو ایک طرف رہا۔
اس کے متعلق سوچتا بھی نہ چاہتا تھا چنانچہ اس خوف سے کہ یہ مسافر اس پر اسرار قمر
سے متعلق کچھ اور نہ پوچھ بیٹھیں وہ قصداً وہاں سے ٹل گیا۔

”یہ اس قدر خوف زدہ کیوں ہو گیا؟“ ڈانکا نے پوچھا۔

”شینڈور کو دیکھ کر سب ہی خوفزدہ ہو گئے تھے۔ غالباً اس سے ہر شخص ڈرتا
ہے۔“ چارلس نے کہا۔

ہیلن نے کہا۔ ”اگر ہمیں وقت پر جوزف باؤ پہنچنا اور وہاں تفریح۔۔۔“

”لیکن۔۔۔“ چارلس نے سر کھجایا۔

”لیکن یہ کہ ہمارے پاس اتنا وقت تو نہیں ہے کہ راستہ میں رک کر ان قمروں
کو تلاش کرتے پھریں جن کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔“ ایلن نے اپنی بیوی کے دلکی
بات کہہ دی۔

”ہم شروع میں ہی اپنا پروگرام بنائے اور وقت کا تعین کر چکے ہیں۔“

ہیلن بولی۔ ”اور ہمیں آخر تک اس پر عمل کرنا ہے۔“

”ہم۔“ چارلس نے سر ہلایا۔

اور اس نے ڈانکا کی طرف دیکھا جو زینہ کے قریب کھڑی اپنے شوہر کا انتظار

ملوائیں سنائیں اور کوچ گاڑی کا ایک طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

دوسرا دروازہ کھول کے الین نے اپنی روایتی شان سے باہر قدم رکھا وہ نہ تو غصہ کا اظہار کر رہا تھا اور نہ بے چینی کا۔

”اب کیا ہوا۔“ چارلس نے غصہ دبائے کے لئے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھیج لیں۔

”میں آپ لوگوں کو اسی جگہ اتار رہا ہوں۔ ٹھیک ہے؟“ کوچوان نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

”کیا آگ آئی؟“ چارلس چیخا۔

”آپ لوگ اسی جگہ اتر جائیں گے صاحب۔“ کوچوان بولا۔

”یعنی یہ کیا مذاق ہے! ہم ”یہاں کیوں اترنے لگے؟“ چارلس نے حیرت سے کہا۔ ”مور تم ہمیں یہاں کیوں اتارنے لگے؟“

چارلس نے چاروں طرف دیکھا۔ چوراہے سے ہٹ کر کسی لکڑہارے کی مجموعی نظر آئی۔ لیکن وہ خالی پڑی تھی۔ دور دور تک کسی آبادی اور کسی انسان کا پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف عجیب ویرانی اور وحشت برس رہی تھی معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہاں کبھی کوئی آیا نہیں، مکمل ترین خاموشی بل کھاتا ہوا راستہ اور اندھیرا آسمان جو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جھکا آ رہا ہو۔

”یہ جوزف باد تو نہیں ہے۔“ چارلس نے کہا۔

”یہاں یا تو کچھ گڑبڑ ہے یا پھر ہم میں جو کچھ طے ہوا ہے وہ صاف نہ تھا۔“ الین نے کہا ”چنانچہ اب مناسب ہو گا کہ ہم ساری باتیں صاف کر لیں۔ غالباً ہم نے تم سے یہ طے کیا تھا کہ ہمیں جوزف باد پہنچا دو گے ٹھیک ہے؟“

”ٹھیک ہے“ کوچوان نے کہا۔

ایک چوراہے پر ان کی کڑکھڑاتی ہوئی کوچ گاڑی دھنسا کر رک گئی یہ چوتھی دفعہ گاڑی روک دی گئی تھی اس سے پہلے بھی تین دفعہ کوچ گاڑی راستہ میں بے وجہ ہی روکی تھی جس کی وجہ سے کوچوان نے گاڑی روک لی ہو البتہ ایک دفعہ گاڑی روکنے کی وجہ جلد ہی ظاہر ہو گئی تھی۔ گاڑی کا ایک پیہ راستہ کے کنارے والے کھڈ میں پھنس گیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ایک نہ دو پورے چار گھنٹوں کی تاخیر کے بعد وہ لوگ آگے روانہ ہو سکے تھے۔

لندن میں بیٹھ کر ان لوگوں نے جو پروگرام بنایا تھا اور جس طرح وقت کا تعین کیا تھا کہ اتنے بجے فلاں مقام سے روانہ ہو کر اتنے بجے تک فلاں مقام پر ضرور پہنچ جائیں گے سو اس پر ٹھیک سے عمل کرنا کم سے کم اس علاقہ میں تو ممکن نہ تھا۔ پروگرام بناتے وقت راستہ کی دقتوں، گاڑی کے ٹوٹنے پھوٹنے یہاں کے لوگوں کی بے مروتی اور عدم تعاون کا ان مسافروں نے خیال ہی نہ کیا تھا اور اس کا خیال کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہر جگہ ان کا استقبال کیا جائیگا لوگ بڑی مہمان نوازی اور تعاون کا ثبوت دیں گے اور وہ لوگ بڑے مزے سے بلانا خیر اور کسی بھی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر اپنا سفر جاری رکھ سکیں گے۔ لیکن ان کے یہ سب اندازے غلط ثابت ہو رہے تھے۔

”کوچوان کو خدا جانے کیا ہو گیا تھا۔ کہ وہ خواہ مخواہ دیر کر رہا تھا“ وقت اور بے وقت اور بلا وجہ گھوڑوں کی لگائیں کھینچ کر گاڑی روک لیتا تھا وہ پاگل تو معلوم نہ ہوتا تھا پھر کیا وجہ تھی کہ اب یہ چوتھی دفعہ اس نے گاڑی روک دی تھی۔“

چارلس اب برداشت نہ کر سکتا تھا اس نے دانت پیسے منہ میں کوچوان کو دو چار

”تو پھر۔۔۔؟“

”تو پھر یہ کہ آپ وہاں پیدل جا سکتے ہیں جو زف بادریاں سے دور نہیں ہے۔“

”کیا۔۔۔؟“

”صرف دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔“ کوچوان نے کہا۔

”پیدل جا سکتے ہیں!“ چارلس نے کہا۔ ”کوچوان! تمہاری عقل ٹھکانے پر ہے کہ

نہیں؟“

”میری عقل تو ٹھکانے پر ہے صاحب۔ لیکن آپ کی نہیں ہے۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟۔۔۔ یعنی۔۔۔ کوئی دم میں اندھیرا اتر آئے گا۔“

”اندھیرا!“ کوچوان کانپ گیا۔

اور اس نے سر اٹھا کر اندھیرے آسمان کی طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ کوچوان کی یہ گستاخی بے جھن کو دینے والی تھی، چارلس نے اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی سمجھ لی۔ اس کا ارادہ تھا کہ کوچوان پر چھلانگ لگا دے اور اسے نیچے گھسیٹ کر مارے گونوں سے اس کی عقل ٹھکانے لگا دے لیکن کوچوان شاید اس کے ارادے سے واقف ہو چکا تھا چنانچہ اس نے چابک گھسیٹ کر سر سے بلند کر لیا اور وہ چارلس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔

”ہم میں اور تم میں“ ایلین نے کہنا شروع کیا۔ ”یہ طے ہو چکا تھا۔۔۔۔۔“

”میں نے آپ کی پیشکش قبول کر کے غلطی کی ہے“ کوچوان نے کہا۔

”میں سمجھا نہ تھا مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔“

”یہ تم جھوٹ بک رہے ہو۔ تم نے سب کچھ سمجھ کر ہی ہماری پیشکش قبول کی

تھی۔“

”براہ کرم آپ یہاں اتر جائیے۔ آپ سب اتر جائیے۔ میں یہاں سے آگے نہ

جاؤں گا۔“

”الو کے ٹپے“ ٹالاقی کہنے۔“

چارلس برداشت نہ کر سکا اور اس نے اپنا گونہ بلند کیا۔ کوچوان نے چابک چلا دیا۔ اور وہ چارلس کے پائیس کان کے سڑا کے کی آواز پیدا کرتا ہوا جھک گیا ایلین گاڑی کے دوسری طرف کھڑا ہوا تھا وہ جلدی سے آگے بڑھا۔ اور گھوڑوں کے سروں کے سامنے سے گزرتا ہوا چارلس کے قریب آگڑا ہوا۔ وہ اپنے بھائی کی مدد کو آیا تھا لیکن اس کی نگاہیں جیسے اتفاقاً چارلس کی پشت کی طرف اٹھ گئیں وہ حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے چارلس کے پیچھے دیکھنے لگا۔

”ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ دیکھو۔“ ایلین نے دہی ہوئی آواز میں کہا۔

کوچوان کی گردن بے اختیار اس طرف گھوم گئی۔ جس طرف ایلین نے اشارہ کیا تھا وہ کانپ گیا۔ اور جیسے ہی جبرا اپنی گردن دوسری طرف گھما کر اس چیز پر نگاہیں ہٹانے میں کامیاب ہو گیا کوچوان اس کتے کی طرح کانپ رہا تھا جو سرد اندھیری اور طوفانی رات میں کسی سرد تالاب میں سے گر کر نکلا ہو۔

چارلس نے ایلین کی اٹھی ہوئی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔

”تھرا!“ اس نے حیرت سے کہا۔

سرکسی دھندلے اور برف پوش پہاڑوں کے پس منظر میں ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہوا وہ قدیم اور عظیم الشان قصر کسی بھی سیاح کو اپنی طرف کھینچ سکتا تھا۔ قصر کے پہاڑوں طرف دہانے دار اور اونچی پہاڑیاں تھیں جو شام کے اندھیرے میں دھندلی نظر آ رہی تھیں لیکن قصر کی بلند اور سنگین فصیل اور اس کے برج نظر آتے تھے فصیل اور برج بھی جگہ جگہ سے سیاہ ہو رہے تھے یہ غالباً کالی تھی جو قصر کی قدامت کا پتہ دیتی تھی۔

چارلس نے کوجوان کی ایک ٹانگ کو جھنجھوڑ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”کوئی جگہ ہے وہ؟ اس نے پوچھا؟“

”کوئی جگہ؟“ کوجوان نے انجیل بن کر پوچھا۔

”وہ قمر اتم کئی دفعہ اس کے قریب سے گزرے ہوئے اور چونکہ اس علاقہ سے واقف ہو اس لئے اس قمر کا نام جانتے ہوئے کیا نام ہے اس کا۔؟“

”کونسا قمر؟“ کوجوان نے گویا آنکھیں بند کر کے پوچھا۔

”وہ کیا ہے اس پہاڑی کی چوٹی پر۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔“

”میں کوئی قمر نہیں دیکھ رہا۔“ کوجوان نے کہا۔

اور یہ اس نے غلط نہ کہا تھا۔ یقیناً وہ کوئی قمر نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ قصداً مخالف سمت دیکھ رہا تھا کوجوان اپنی جگہ پر بیٹھا ہونے ہوئے کانپ رہا تھا۔

چارلس اب برداشت نہ کر سکتا تھا اس نے دوسرا ہاتھ بھی بڑھا کر کوجوان کی ٹانگ پکڑ لی کہ اسے گاڑی پر سے گھسیٹ کر نیچے ڈال دے۔ کوجوان نے بڑی کینگی کا ثبوت دیتے ہوئے چارلس پر چابک چلا دیا۔ چابک کی رسی گنگنا اٹھی بے اختیار چارلس کے منہ سے ایک گالی نکل گئی اور اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ کوجوان کو نیچے گھسیٹ لیا اور اب وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے دھول میں لوٹ رہے تھے۔

چارلس کوجوان کی گرفت سے آزاد ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ایلن دوڑ کر چارلس کے قریب آیا۔ اب وہ دو تھے اور کوجوان اکیلا تھا چنانچہ یقین تھا کہ وہ دونوں مل کر اسے ذبح کر لیں گے۔ لیکن کوجوان جب اٹھ کھڑا ہوا تو اس کے دائیں ہاتھ میں ایک خطرناک چاقو تھا جو استرے کی طرح تیز تھا اور یہ بڑا سا پھل سورج کی آخری کرنوں میں اور آخری دھمکی آیزاء اذ میں چمک رہا تھا۔

ایلن کے پیر تو جیسے زمین میں گڑ گئے چنانچہ وہ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ البتہ

چارلس آگے بڑھا اور کوجوان نے چاقو جھونکنے کے سے انداز میں اپنا ہاتھ اس کی طرف ایک جھٹکے سے بڑھا دیا۔

”بس بہت ہو چکا۔“ کوجوان نے کہا۔ ”اپنی عورتوں کو گاڑی میں سے اتار لو۔“

چارلس اور ایلن بت بنے کھڑے رہے۔

”اتار لو۔“ کوجوان نے کڑک کر کہا۔

کوجوان کی آواز میں جو کڑک اور دھمکی تھی اس نے چارلس کو یقین دلادیا کہ اب بحث کرنا فضول تھا یہ نہ تو صحیح یا غلط کا سوال تھا نہ اخلاق اور بد اخلاق کا اور نہ ہی تہذیب اور بد تہذیب کا۔ کوجوان بد تمیز ہو یا باتمیز، بد اخلاق ہو یا خوش اخلاق بہر حال اس وقت اس کے سر پر بموت سوار تھا وہ لوگ ایک اجنبی ملک کے غیر آباد اور ویران علاقے میں تھے کوجوان خوف اور غصے سے پاگل ہو رہا تھا چنانچہ خیمہ بت اسی میں نظر آتی تھی کہ اس سے بحث کرنے یا اخلاق و شانگسی کا سبق پڑھانے کے بجائے اس کے اس نادری حکم کی تعمیل کی جائے۔

چارلس کے ان خیالات کو ایلن نے زبان دی، ڈانٹا اور ییلن گاڑی کی کھڑکیوں میں سے خوفزدہ اور پریشان نظروں سے باہر جھانک رہی تھی ایلن نے ان کی طرف ہاتھ ہلا کر کہا۔

”اتر آؤ۔“

”جی! ییلن نے تھوک نکل کر کہا۔

”ارے بھی سنائیں کوجوان صاحب کا حکم؟ نیچے اتر آؤ۔“

دونوں عورتیں گاڑی میں سے اتر آئیں۔ ان کے نازک بوجھ تلے گاڑی کا پائیدار چرچا کر رہ گیا۔ دھننا ”کوچ گاڑی میں جتے ہوئے گھوڑوں میں کا گھوڑا نہانے اور زمین پر ٹاپ مارنے لگا“ وہ کسی وجہ سے خوفزدہ معلوم ہوتا تھا اور ایسا لگتا

آپ موجود ہوئے۔

اور اس سے پہلے کہ وہ اسے سمجھاتے، اس سے کوئی معاملہ طے کرتے کوہان نے چابک بھاگ گھوڑوں کو اشارہ دیا۔ گھوڑے پہنکار کر اور ہنسنا کر پیچھے ہٹے گاڑی کے پیچھے چڑھائے اور وہ اسی طرف گھوم گئی جس طرف سے وہ لوگ اس میں سوار ہو کر آئے تھے۔

کوہان نے سر اٹھا کر اندھیرے آسمان کی طرف اور پھر چاروں طرف دیکھا، اس کے شرے سے انتہائی خوف عیاں تھا، اس نے اندھیرے میں جنگل کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے خوف تھا کہ درختوں کے مہیب سایوں میں سے ان دیکھی بلائیں نکل آئیں گی۔ اس نے جلدی جلدی اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور پاگلوں کی طرح گھوڑوں پر چابک برسا دیئے۔ اور وہ خالی گاڑی کو لے کر حیرت انگیز تیزی سے بھاگ پڑے۔ اور وہ چاروں اس چور ہے پر کھڑے گاڑی کو اندھیرے میں غائب ہوتے دیکھتے رہے۔

”وہ ٹھگ تو نہ تھا۔“ چارلس نے کہا۔

”ہاں۔ نہ تھا۔“ ایلین بولا۔

”لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمارا سامان ہمارے پاس ہی رہ گیا اور یہ بھی قیمت ہے ورنہ کہیں شنگے بوجھ مارے مارے پھرتے۔“

ایلین کے مقابلے میں ڈانکا کی عقل کچھ زیادہ منجھی ہوئی تھی اور بعض دفعہ وہ بالکل منطقی اور صحیح سوال پوچھ جاتی تھی۔ چنانچہ اس نے پوچھا۔

”مگر وہ کل آکر ہمیں لے جانے کے لئے تیار ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آج ایسی بدحواسی سے کیوں بھاگ گیا؟ اگر وہ کل صبح سورج طلوع ہونے کے بعد یہاں آسکا اور ہمیں لے جاسکتا ہے تو پھر۔۔۔۔۔“

تھا جیسے وہ جلد از جلد وہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔

کوہان کی طرح چارلس بھی کانپ رہا تھا، لیکن کوہان کی کچھ شاید خوف کی تھی اور چارلس کی حد سے بڑھے ہوئے غمے کی۔

”اس کی ایسی کی تھی۔“ چارلس نے دانت پیس کر کہا۔

چارلس دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھیج کر کوہان کی طرف بڑھا۔

موثر انداز کرنے چاقو والا ہاتھ بلند کیا تو ڈانکا نے اپنے شوہر کا بازو تھام لیا۔

”جانے دو چارلس۔“ ایلین نے بڑے خشک لہجہ میں کہا۔ ”یہ شخص ٹھگ ہے

چنانچہ ہمارا سامان لے جانا چاہتا ہے۔“

کوہان ایک لمحے تک جہاں تھا وہیں کھڑا رہا، اور پھر گاڑی پر جا چڑھا گاڑی کی چھت پر ان چاروں کا سامان ایک رے بندھا رکھا ہوا تھا کوہان کے چاقو کا پھل پھر چکا اور ”کٹ“ سے رسہ کٹ گیا جس سے سامان بندھا ہوا تھا۔ ایک چوکرور بکس کچھ دیر تک چھت کے کنارے پر جھولتا رہا اور پھر بڑی آواز کے ساتھ نیچے گر۔ دوسرے بکس آسانی سے نیچے پھسل آئے۔ دو بکس گاڑی کے ایک طرف اور تین دوسری طرف گرے۔

ڈانکا اور ایلین گرتے بکسوں سے بچنے کے لئے جلدی سے کئی قدم پیچھے ہٹ گئیں، چارلس نے ڈانکا کی گرفت سے اپنا بازو چھڑایا اور آگے بڑھ کر اس چھوٹے بکس کو پکڑ لیا جو ایک طرف لڑھکا جا رہا تھا۔

کوہان نے اپنی جگہ بیٹھ کر لگائیں تھام لیں۔

”کل میں واپس آجاؤں گا۔ سورج طلوع ہو جانے کے بعد میں اسی جگہ آپ لوگوں کا انتظار کروں گا۔ اور اگر آپ لوگوں میں سے کوئی یہاں موجود ہوا تو اسے گاڑی میں بٹھا کر لے جاؤں گا۔ لیکن جو زف باد نہیں بلکہ واپس لے جاؤں گا۔ ہاں اگر

تھیں۔

”بہت دور ہیں۔“ چارلس نے کہا۔

”ہاں۔ لیکن قریب آسکتے ہیں“ ڈانکا نے کہا۔

”شاید وہ اس طرف نہ آئیں گے“

”لیکن۔ لیکن۔ میں نے تو سنا ہے کہ بھیڑیے یا تو رات گئے چلاتے ہیں یا پھر چاند

کو دیکھ کر بھونکتے ہیں۔“ ہیلن نے کہا۔

”بھائی! یہاں کے لوگ ترالے ہیں چنانچہ بھیڑیے بھی ترالے ہی ہوں گے“

چارلس نے ہنس کر کہا۔



”اندھیرے سے ڈرتا ہے بھارا“ چارلس نے سنجیدگی سے کہا۔

ڈانکا نے چارلس کی طرف دیکھ کر منہ بنایا اور اپنی ناک اچکا دی اور پھر ان ساتوں کا جائزہ لینے لگی جو ان چاروں کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ پہاڑوں اور درختوں کے سائے، چٹانوں کے سائے اور انسان کے بنائے ہوئے بنے رنگ برنگوں کے سائے۔ اور ڈانکا نے نہ جانے کیوں خوف سے جھرجھری لے کر چارلس سے پوچھا۔

”یہ کچھ ان کے اندھیرے سے ڈرنے کی بات تم نے سنجیدگی سے کہی تھی؟“

”ارے نہیں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا“ چارلس نے جلدی سے جواب دیا۔

”یہاں کے عمدیہ ادوں سے اس کی شکایت کر دینی چاہئے۔ میرا مطلب ہے کہ کچھ ان کی“ ہیلن نے پھنکار کر کہا ”شاید ہم اس کا لائنس منسوخ کروانے میں کامیاب ہو جائیں۔“

”سیری اچھی بھائی یہ نہ بھولو کہ ہم لندن میں نہیں ہیں۔“ چارلس نے کہا۔ شاید یہاں عمدے دار ہیں ہی نہیں جن سے شکایت کی جاسکے۔ اور اگر ہوئے بھی تو وہ شاید ہماری مدد نہ کریں گے۔ اور یہ تو بہر حال بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال ہم تو اس اجاڑ جگہ کھڑے ہیں اور یہاں انسان تو انسان کوئی جانور تک نظر نہیں آتا۔“

”جانور شاید نہ ہوں لیکن درندے ضرور ہیں“ ڈانکا نے کہا۔ ”سنو! میں چند

آوازیں سن رہی ہوں۔ تم بھی سن رہے ہو یا میرا وہم ہے؟“

چارلس اور ہیلن کان لگا کر سننے لگے۔ ڈانکا نے غلط نہ کہا تھا۔ کہیں دور سے بہت دور سے آوازیں آرہی تھیں۔۔۔ بھڑوں کے چلانے کی آوازیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بھڑوں کا پورا غول کہیں بیٹھا ایک آواز ہو کر چلا رہا تھا۔ یہ آوازیں بہت مدھم تھیں لیکن اس دیرانے کی خاموشی میں بڑی ہی بھیاںک اور لرزہ خیز معلوم ہوتی

”کوچوان نے قعر کے وجود سے کیوں انکار کر دیا۔؟“
”ہیں!“

”یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا لیکن کیا وجہ تھی کہ اس نے قعر کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ہمارے بار بار توجہ دلانے کے باوجود اس نے قعر کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا۔“
اور اب ان تینوں نے گردنیں گھما کر قعر کی دیکھا۔ وہ لوگ اب بھیڑیوں کو بھول چکے تھے۔

خدا جانے کیوں چارلس نے یقین کر لیا تھا کہ وہ قعر کھنڈر ہو گا۔ اس کے برج اور یہ فیصل غالباً یہاں سے سالم اور مضبوط نظر آتی ہوگی لیکن یہ برج اور یہ فیصل دراصل ایک خول ہو گا اور اس خول میں کچھ نہ ہو گا سوائے ٹوٹی ہوئی عمارت کی بے چہت اور تنگی دیواروں اور ٹوٹے پھوٹے ننگے ستونوں کے لیکن اب جو اس نے قعر کی طرف دیکھا۔ تو چونکا اور اسے اپنا پچھلا خیال بدلنا پڑا۔ قعر کی تین کھڑکیاں نہ صرف کھلی تھیں بلکہ روشن تھیں۔ ان کھڑکیوں کے پیچھے جو کمرے تھے یا جو کچھ بھی تھا ان میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ روشنی بہت دور ٹٹماتے ہوئے تین چھوٹے ستاروں کی طرح معلوم ہوتی تھی لیکن بے شک وہ شبہ و شک وہ روشنی ہی تھی۔

”قادر شینڈور نے غلط نہ کہا تھا“ چارلس بولا ”قعر موجود ہے اور ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ ہاں اگر یہ نظر کا دھوکا ہو تو بات دوسری ہے۔ لیکن یہ نظر کا دھوکا ہوتا تو قعر ہم چاروں میں سے، بلکہ پانچ میں سے کیونکہ کوچوان بھی اس کے وجود سے واقف تھا، کسی ایک کو نظر آتا۔ لیکن چونکہ اس وقت ہم چاروں اسے بیک وقت دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے قعر ایک حقیقت ہے۔“

”لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر شخص اس کے وجود سے متبرک کیوں ہے؟“
الین نے کہا ”کمال تو یہ ہے کہ نقشے میں بھی اس کی نشان دہی نہیں کی گئی۔ یہ بات

جس جگہ کوچوان نے انہیں اتارا تھا۔ وہاں سے قعر اندھیرے کے سوا اپنی پوری ہیبت کے ساتھ کھڑا آسپی سائے کی طرح نظر آرہا تھا۔ یہ وہی قعر تھا۔ جو نقشے میں کہیں نہیں تھا۔ اس کے وجود کا کوئی نشان نہ تھا۔ ماسوائے قادر کے سب ہی اس کے منکر تھے۔ کوچوان نے خوف بھری نظروں سے اس قعر کو دیکھا تھا۔ کوچوان کی توجہ دلانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بالکل انجان بن گیا۔ جیسے کہ اس قعر کی طرف دیکھنا تو ایک طرف اس کی طرف رخ کرنا بھی گناہ ہو۔ اس سے اس قعر کے بارے میں معلوم کرنا بالکل بے سود تھا۔ وہ تو اس قعر کی طرف دیکھنا بھی نہ چاہتا تھا۔

الین ان سے چند فٹ دور کھڑا ان کے پیچھے کسی چیز کو دیکھنے میں مگھ رہا تھا۔ چارلس ڈانٹا اور الین قعر کو ایک نظر دیکھ کر اسے گویا بھول ہی گئے تھے لیکن اس قعر نے الین کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ اس وقت بھی اس پہاڑی پر کھڑے ہوئے عظیم الشان قعر کی طرف ایک عالم بے خودی میں دیکھ رہا تھا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔“ الین نے کہا۔
”کیا؟“ چارلس نے کہا۔

ایلن نے بھی کچھ کہے بغیر کندھے جھٹک دیئے۔
”میرے خدا! وہ کیا ہے؟“ ڈانٹا نے کہا۔

اور ان سب نے اس طرف دیکھا جس طرف ڈانٹا اشارہ کر رہی تھی، اندھیرے جنگل میں کچھ تھا، ایک نیلے رنگ کا ننھا سا شعلہ جو الف کی طرح سیدھا کھڑا تھا۔
”واقعی یہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟“ چارلس نے کہا، شاید کسی جموہپڑی میں دیا جل رہا ہے۔“

”لیکن یہاں کوئی جموہپڑی نہ تھی۔“ ہیلن بولی۔ ”اور پھر اگر جموہپڑی میں دیا جل رہا ہوتا۔ تو دو باتیں ہوتیں۔ اول تو شعلہ سرخ ہوتا۔ اور پھر وہ زمین سے کافی اونچا ہوتا۔ لیکن یہ شعلہ نیلا ہے۔ اور جیسے زمین سے لگا ہوا ہے۔“
”میں دیکھتا ہوں جا کر یہ کیا بلا ہے۔“ چارلس نے ایک قدم بڑھایا۔
”نہ جاؤ۔ خدا کے لئے نہ جاؤ۔“ ڈانٹا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ”اور پھر بھڑیے بھی شاید قریب آگئے ہیں۔“ ہیلن نے کانپ کر کہا۔

چارلس اور ہیلن بھڑیوں کو واقعی بھول گئے تھے اب جو وہ اس طرف متوجہ ہوئے، تو ان کے چلانے کی آوازیں قریب سے، بہت ہی قریب سے سنائی دیں، صرف یہی نہیں بلکہ نیلے شعلے کے آس پاس چند سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔
”بھڑیے!“ ڈانٹا نے تقریباً چیخ کر کہا۔

”یہ شاید بھڑیے نہیں ہیں۔ یہ تو کچھ غیر مادی چیزیں معلوم ہوتی ہیں“ چارلس نے کہا۔

”غیر مادی چیزیں کیا ہوتی ہیں؟“

”میں ان میں یقین نہیں رکھتا ورنہ کہہ دیتا کہ یہ بھوت پریت ہیں۔“ چارلس نے ہنس کر کہا۔ بہر حال ڈرو نہیں۔ اندھیرے، جنگل تنہائی اور ایسی بھیاںک رات میں

نہیں کہ قہر نیا ہو۔ خاصا قدیم ہے چنانچہ نقشہ بنانے والے اس کے وجود سے متاوقف ہوں یہ بات بعید از قیاس ہے۔“

”فادر شینڈر نے کہا تھا کہ ہم قصر کے قریب بھولے سے بھی نہ جائیں“ ڈانٹا نے کہا۔

”اور میں فادر شینڈر سے متفق ہوں“ ہیلن نے کہا ”اس قصر میں یقیناً کوئی خاص بات ہے۔ خواہ مخواہ میرا دل دھڑکنے لگا ہے اور مجھ پر عجیب ہی طاری ہونے لگی ہے۔ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔“

چارلس نے حیرت سے اپنی بھابی کی طرف دیکھا آج یہ اس نے عجیب بات کہی تھی کہ اس کے دل پر ہیبت طاری ہونے لگی تھی۔ وہ ہیلن کو جانتا تھا۔ اور اس کے مزاج سے واقف تھا۔ نسوانی کمزوری کا اظہار کر کے خوفزدہ ہونا، یا بے ہوش ہو جانا۔ اس کے اصول کے خلاف تھا کوچوان کے گستاخانہ سلوک کے بعد اسے فطش آجانا چاہئے تھا۔ اور چارلس کو یقین تھا کہ ہیلن غصہ میں پھر پختی قصر کی طرف چل دے گی۔ ڈھلان چڑھ کر وہاں پہنچ جائے گی، اور دروازے پر دستک دے گی۔ بڑی شان سے ملکہ کی طرح اس میں داخل ہوگی اور قصر کے کینوں کو حکم دے گی کہ فوراً کسی کو سرائے کی طرف دوڑا دیا جائے۔ بلکہ خود بادشاہ فرانس جوزف کے پاس آدمی بھیج کر اس تالائق کوچوان کی شکایت کی جائے اور اسے سزا دلوائی جائے لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس کے برخلاف وہ خوفزدہ تھی، اور فادر شینڈر کے اس مشورے سے متفق تھی کہ قصر کے قریب نہ جایا جائے۔

چارلس اپنے بھائی سے مشورہ کرنے لگا۔ کہ اب کیا کیا جائے، ایلن عمر میں بڑا ضرور تھا۔ لیکن ان لوگوں میں سے تھا۔ جن سے کبھی کوئی مشورہ کیا جاتا ہے۔ تو وہ شانے اچکا کر خاموش ہو رہتے اور اپنے آپ کو دوسروں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ چنانچہ

”اور پھر صبح۔۔۔۔۔“

دھنسا ”اس کی آواز ڈوب گئی اور چارلس جھونپڑی کے دروازے میں سے نکل کر
ڈانکا کے قریب آکھڑا ہوا۔ اگر وہ بھوتوں پر یقین رکھتا تو یہ بھی یقین کر لیتا کہ یہ جنگل
بھوتوں کا مسکن تھا۔ عجیب عجیب خلاف عقل باتیں ہو رہی تھیں یہاں۔

”بھینڑیوں کی آواز ایک دم سے بہت قریب آگئی تھی۔ جیسے وہ ان کے چاروں
طرف پھیل گئے ہوں اور آہستہ آہستہ اپنا حلقہ تنگ کر رہے ہوں۔ اور جنگل میں اب
ایک کے بجائے تین شطے نظر آرہے تھے جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر الف کی
طرف کھڑے تھے۔

لور اب وہ سب ایک اور آواز بھی سن رہے تھے دور سے آتی ہوئی مدھم آواز۔
یہ آواز کہیں سامنے سے اور جنگل میں سے آرہی تھی اور بڑی تیزی سے ان کی
طرف بڑھ رہی تھی۔ لور اب وہ چاروں بجھی کے گھوڑوں کے سازو سامان کی جھنکار
پیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز صاف سن رہے تھے بجھی یا کوچ
گاڑی یا جو کچھ بھی وہ تھی سیدھی ان کی طرف آرہی تھی۔

”معلوم ہوتا ہے اس گستاخ کو جو ان کو ہماری حالت پر رحم آگیا ہے۔“
ایلن نے کہا۔ ”وہ حضرت اپنا ارادہ بدل کر صبح کے بجائے اسی وقت لینے
آگئے ہیں۔“

”تمہارا خیال شاید غلط نہیں ہے۔“ ایلن نے کہا۔

اور وہ لوگ جھونپڑی کے قریب کھڑے دیران چوراہے کی طرف پر امید نظروں
سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن یہ آواز اس سمت سے نہ آرہی تھی۔ جس طرف کو جو ان
اپنی کوچ لے کر بھاگ گیا تھا۔ یکایک اور خلاف توقع ایک بجھی قہروالے ٹیلے کی
ڈھلان پر آگ آئی ہو۔ جھاڑیوں اور پھر درختوں کے جھنڈ میں سے نکل آئی۔ وہ

اوٹ پٹانگ چیزیں نظر آیا ہی کرتی ہیں۔“

”بہر حال بھینڑیے تو غیر مادی ظاہر ہے کہ نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمیں کسی جگہ پناہ
لینی چاہئے۔“ ایلن نے کہا۔

اور چارلس نے لکڑہارے کی جھونپڑی کی طرف ہاتھ ہلا کر کہا۔

”ہم آگ جلا کر اس جھونپڑی میں قیام کر سکتے ہیں۔“

”یہاں کھلی جگہ سے تو وہ جھونپڑی بہتر ہے۔“ ایلن نے کہا۔

چنانچہ چارلس اور ایلن نے بڑے اور دزنی بکس اٹھائے اور چھوٹے اور ہلکے بکس
عورتوں کے لئے چھوڑ دیئے۔ وہ چاروں جھونپڑی کے قریب پہنچ گئے دروازہ کھولنے
کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اس کی چولیس ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ اور کواڈرڈینز کے پتھر پر
آرہے تھے چارلس نے کواڈر کو اپنے کندھے سے دھکا دیا تو وہ ایک چراگ کی آواز کے
ساتھ کھل گیا۔

جھونپڑی تنگی اور خالی تھی۔ ایک کونے میں لکڑیوں کا انبار تھا۔ یہ ایندھن تھا۔
اس کے قریب خشک پھونک ٹہنیاں احتیاط سے رکھی ہوئی تھیں۔

”رزد ہوٹل کا سا تو آرام یہاں نہ ملے گا۔“ چارلس نے کہا ”لیکن پھر بھی غیبت
ہے۔“

ایلن نے جھونپڑی کے دروازے میں کھڑے ہو کر ”سوں“ سے اندر کی ہوا
سوکھی اس میں دھول اور قدامت کی بو تھی۔ بہر حال خود ایلن نے کہا تھا کہ کھلی جگہ
سے یہ جھونپڑی بہتر ہے۔ اور چارلس نے سوچا کہ قدرت کا یہ قرب اندھیرا جنگل اور
یہ بھیانک رات اس کی بھابی کا مزاج شاید بدل دے گی۔ اور خدا جانے کیوں اس نے
ایلن کی تکلیف کے خیال سے ہی اپنے دل میں مسرت کی لہری محسوس کی۔

”ہم جھونپڑی کے دروازے کے سامنے الاڈ جلا سکتے ہیں“ ڈانکا کہہ رہی تھی

گھوڑے بکھی کو کھینچتے ہوئے حیرت انگیز اور خطرناک تیزی سے بدستور بھاگے
آ رہے تھے۔ جیسے ہر اس چیز کو کچل کر رکھ دیں گے جو ان کی راہ میں حائل ہوگی۔
”چارلس! ہٹ جاؤ راستہ سے۔“ ڈانٹا چلائی۔

چارلس اپنی ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑا ہو گیا اب وہ تیار تھا کہ بکھی اور گھوڑے
قریب آئیں، تو وہ اچھل کر ایک طرف ہٹ جائے اور قریب سے گزرتی ہوئی بکھی کے
گھوڑوں کی لگائی پکڑ کر انہیں روک لے۔ لیکن اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔
چوراہے کے قریب پہنچ کر گھوڑوں نے دفتا اپنی رفتار کم کر دی اب وہ ہلکے
چل رہے تھے اور پھر چارلس کے عین سامنے لیکن ان سے کوئی چھ فٹ دور آکر رک
گئے دفتا۔ جنگل کی خاموشی اور بھی گہری ہو گئی۔ دونوں گھوڑے خاموش کھڑے ایک
دوسرے کی تھو تھنی چاٹ رہے تھے اور ایک دوسرے سے جیسے کچھ کہہ رہے تھے۔
”ہو۔ ہو۔ ہو۔“ کہیں دور سے ککڑ بھگنے کی قہقہہ نما چیخ سنائی دی اور اس
نے لمحہ بھر کے لئے خاموشی کی چادر میں شکاف ڈال دیا۔

چارلس آگے بڑھا۔

”ہو۔ ہو۔ ہی۔ آ۔ آ۔“ مردار خور ککڑ بھگا کسی پاگل شخص کی طرح چیخ پڑا
بمیز پر خاموش تھے وہ کہیں غائب ہو گئے تھے۔

چارلس گھوڑوں کے سامنے جا کھڑا ہوا پہلے اس نے ایک گھوڑے کے اور پھر
دوسرے گھوڑے کے سر پر ہاتھ پھیرا وہ بد کے اور نہ نہنٹائے اس نے لگائی پکڑ لیں
گھوڑے اب بھی بے حرکت کھڑے رہے۔
الین آگے بڑھ کر اپنے بھائی کے قریب آ گیا۔
”بڑی حیرت انگیز بات ہے یہ تو“ وہ بولا۔

”چنانچہ اس حیرت انگیز بات سے یہ ثابت ہوا کہ معجزوں کا دور ابھی گزرا

خطرناک تیزی سے تنگ اور دیر ان سڑکوں کے اتصال کی طرف بھاگی آ رہی تھی۔
ایک کالے رنگ کی بکھی جسے دو بے حد عمدہ گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ اور ان
گھوڑوں کا رنگ بھی کالا تھا۔

اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس بکھی کو چلانے اور گھوڑوں کو ہانکنے والا کوئی نہ
تھا۔

بمیزروں کی آوازیں یکایک خاموش ہو گئیں، نیلے شعلے دفتا جیسے ہلن زمین میں
اتر گئے۔

ڈانٹا نے اپنے شوہر چارلس کا بازو پکڑ لیا۔ اس کی گرفت مضبوط ہو گئی اور
چارلس نے ان کے ناخنوں کو اپنی جلد میں اترتے محسوس کیا۔

ہیلن نے سرگوشی میں کچھ پوچھا۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا دریافت کر رہی
تھی۔ گھبراہٹ کی وجہ سے اس کے الفاظ اوپر تلے گر کر گنڈھ ہو گئے تھے۔

الین نے کہا، ”اس بکھی کو ہم روک لیں۔؟“

”کوشش کرنی چاہئے۔“ چارلس نے کہا۔

اور وہ آگے بڑھ کر راستہ کے بیچ میں جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر
اٹھا دیئے۔

گھوڑے چارلس کی طرف بھاگے آ رہے تھے ان کی گردنیں جی ہوئی تھیں سر
پیچھے کو ڈھلکے ہوئے تھے۔ اور ان کی لگائی ہوا میں باریک دھاگوں کی طرح اڑاؤ لہرا
رہی تھیں۔ جنگل کے اندھیرے مہیب سایوں میں ان گھوڑوں کے کالے جسم جیسے خود
اپنی آگ میں جل رہے تھے ان کی سیاہ جلد سے ایک عجیب طرح کی مدہم روشنی پھوٹی
معلوم ہوتی تھی۔ ایک طرح کی دوزخی روشنی، بڑی غیر ارضی چمک تھی یہ۔

”چارلس۔۔۔“ ڈانٹا چلی۔

نہیں۔“ چارلس نے کہا۔
 ”لیکن یہ بے کوجوان کی بکھی اور یہ گھوڑے۔۔۔۔۔“
 ”بھائی صاحب!“ چارلس مسکرایا۔ ”جو گھوڑے انعام کے طور پر مل جائیں، پھر ان کی نسل دیکھنا فضول ہے اور اس وقت تو عجیب یا غریب یا غیر عجیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب یہ گھوڑے اتفاقاً ایک بکھی بھی سمجھ رہے ہوں۔“
 ڈانکا اور ہیلن سڑک کے کنارے ایک خوفناک اور بے چینی کے عالم میں کھڑی ہوئی تھیں۔

”چارلس! ایلن! نہیں!“ ہیلن نے کہا۔ ”میرے دل میں ہول اٹھ رہا ہے۔“
 ”کیوں! ہول کیوں اٹھ رہا ہے؟“ چارلس نے پوچھا۔
 ”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ سب کچھ بے حد پر سرار ہے۔“ ہیلن نے کہا۔ ”سراسر غیر قدرتی ہے اور پھر۔۔۔ وہ بھیڑیے ایک دم سے کیوں خاموش ہو گئے۔ جیسے۔ جیسے۔ وہ کچھ جانتے ہوں۔“

اس سے تو چارلس کو بھی انکار نہ تھا کہ بے کوجوان کی بکھی کی آخر واقعی ایک ناقابل فہم اتفاق تھا۔ لیکن وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو ایسی بعید از فہم باتوں پر غور کرتے ہیں۔ اس کے خیال میں تو ایسے سفر میں اگر ایسے عجیب و غریب واقعات نہ ہوں۔ تو پھر سفر کا لطف ہی کیا؟

”تو پھر سوار ہو جائیں بھی؟“ چارلس نے پوچھا۔

ہیلن اور ڈانکا آپس میں اور نیچی آواز میں کچھ مشورہ کرنے لگیں۔ وہ دونوں اس پر اسرار بکھی میں سوار ہونے سے ہچکچا رہی تھیں۔ تاہم پادی النظر میں بکھی بے حد محفوظ آرام دہ اور عمدہ معلوم ہوتی تھی۔ اور گھوڑے بھی کوئل، سدھ ہو گئے۔ گھڑے اور تیز رفتار تھے۔ اور اگر وہ انہیں لے جا کر کسی بہتی کی سرائے میں پہنچا سکتے تھے تو

پھر یہ دونوں عورتیں اس بکھی کی اسرار پر اسراریت کو معاف کر دینے کے لئے تیار تھیں، لیکن یہ تو بعد کی باتیں تھیں فی الحال سوال یہ تھا کہ اس بکھی میں سوار ہوتا۔ مناسب ہو گا یا نہیں۔ جو اپنے آپ ہی اور وہ بھی اس قصر کی طرف سے چلی آئی تھی۔ جس کے قریب تک جانے سے قادر شیشدور نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ دونوں کوئی فیصلہ نہ کر سکیں تو خود چارلس نے انہیں مجبور کر دیا۔

”ہم سامان چڑھائے دیتے ہیں۔ بھائی! آپ ذرا گھوڑوں کو تھامے رہیں۔“ اس نے کہا۔

یہ بڑا فوری حکم تھا۔ اور ہیلن آگے بڑھنے کی بجائے کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ چارلس نے ڈانکا کی طرف دیکھا۔ اور اس بات پر دل ہی دل میں فخر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ کہ ڈانکا بڑی دلیری سے آگے بڑھی اور بڑی بے خوفی سے گھوڑوں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

سامان لاوا جا چکا۔ اندھیرا اور بھی گہرا ہو گیا تھا اور آسمان سیاہ روشنائی کے رنگ کا ہو رہا تھا۔ اور وہ ویران تھا۔ کہیں ایک تنہا سا ستارہ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ چنانچہ ان کو بڑے احتیاط سے اور دھیمی رفتار سفر کرنا تھا۔

چارلس کوجوان کی نشست پر بیٹھ گیا اور اس نے لگائیں تھام لیں ایلن نے سہارا دے کر پہلے ڈانکا کو اور پھر ہیلن کو بکھی میں سوار کرایا۔ ہیلن کانپ رہی تھی اور اس کا جسم سرد ہو رہا تھا۔ اور پھر ایلن نے چارلس کی طرف دیکھا۔

”جوزف باد؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ جوزف باد۔“ چارلس نے بڑے یقین سے جواب دیا۔

”قی۔ آ۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔“ ککڑ بجے نے کہیں دور سے ایک قہقہہ لگایا۔

جوزف باد، زیادہ دور نہ ہو گا۔۔۔۔۔ چارلس نے سوچا۔۔۔۔۔ اب سے کچھ ہی دیر بعد

وہ لوگ وہاں کی کسی عمدہ سرائے کے گرم کمرے میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہوں گے اور اس پر اسرار واقعہ اور اتفاق پر قہقہے لگا رہے ہوں گے اور وطن پہنچنے کے بعد جب اپنے دوستوں کو اس بے کوجوان کی پر اسرار بگھی کا واقعہ سنائیں گے تو وہ بھی مارے حیرت کے دانتوں میں انگلی دے لیں گے۔

جب سے وہ لوگ بگھی میں سوار ہوئے تھے تقریباً اسی وقت سے بھیڑیوں کی آوازیں رفتہ رفتہ ابھرنے لگی تھیں وہ پھر چلانے لگے تھے اور جنگل کے اندر میرے قلب میں ہر ویں بلا شعلہ نظر آ رہا تھا۔

”کسی کی روح ہوگی“ چارلس نے اس کی طرف اشارہ کر کے اور ہنس کر کہا۔
”تو اب چلو۔“ ایلن نے کہا۔

”ج۔ج۔ج۔“ چارلس نے ٹھٹھا کے گھوڑوں کو لگام سے دو طرفہ جھاڑ دیا اور اسی وقت اس نے سوچا کہ خدا جانے گھوڑے ایک اجنبی کے حکم کی تعمیل کریں گے یا نہیں۔

گھوڑوں نے خاموشی اور فرماں برداری سے چند قدم آگے بڑھائے ان کا رخ اس سڑک کی طرف تھا جو جوزف باد جاتی تھی لیکن اس سڑک پر چلنے کے بجائے گھوڑوں نے یکایک اپنا رخ بدلا اور بگھی زاویہ قائم بناتی دو سری طرف گھومنے لگی۔
چارلس نے چونک کر لگائیں کھینچ لیں۔

”ج۔ج۔ج۔“ وہ۔ وہ۔ ج۔ج۔ اس طرف۔ اس طرف۔“ وہ گھوڑوں کو پکارنے لگا۔ لیکن نہیں، گھوڑے جیسے اس کا نہیں کسی اور کا حکم سن رہے تھے اور اب قہقہے لگ جانے والا اندھیرا اور تقریباً نظر نہ آنے والا تھا، بگھی کے پیروں تلے تھا بگھی اسی راستہ پر چل پڑی۔ بگھی کو کھینچتے ہوئے گھوڑے سبک رفتاری سے وہ پہاڑی ڈھلان چڑھنے لگے۔ جو چوڑا ہے سے چند گز کے فاصلہ سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ چارلس

طرف اندھیرا تھا البتہ سامنے اور پہاڑی کی چوٹی پر قصر کی کھلی ہوئی کھڑکیوں کی روشنی نظر آرہی تھی اور بس۔

چارلس نے پوری قوت سے لگائیں کھینچ لیں لیکن گھوڑوں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا، ان کی گردنیں بدستور تھیں رہیں اور وہ بدستور اس پر اسرار قصر کی طرف بڑھتے رہے جہاں سے وہ آئے تھے یا شاید پیچھے گئے تھے۔

گھوڑوں کو روکنے کی کوشش کرنا فضول تھا۔ چنانچہ چارلس نے انہیں روکنے کی کوشش ترک کر کے لگائیں ڈھیلی چھوڑ دیں رفتار نہ کم ہوئی اور نہ زیادہ مناسب رفتار ہے ڈھلان پر چڑھتے رہے چنانچہ اب کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا سوائے اس کے کہ صورتحال کو بڑے صبر و سکون سے قبول کر لیا جائے، بہت ممکن تھا کہ قصر کے کین بڑے مسلمان نواز اور شریف لوگ ثابت ہوں انہیں کھلائیں پلائیں اور کوجوان کا بھی انتظام کر دیں جو انہیں جوزف باد تک پہنچا دے۔ چارلس نے سوچا۔۔۔ قصر کے مالک کے گھوڑے شاید بدک کر کسی وجہ سے خوفزدہ ہو کر بگھی لے کر بھاگ پڑے تھے اور چونکہ وہ لوگ گھوڑوں اور بگھی کو واپس قصر تک پہنچا رہے تھے اس لئے قصر اور بگھی کا مالک انہیں ان کے اس احسان کا صلہ ضرور دے گا۔

لیکن معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہ گھوڑے خود بھی جلد از جلد قصر تک پہنچ جانا چاہتے تھے، اس کے علاوہ وہ راستہ سے پوری طرح واقف تھے کیونکہ اندھیرے میں چارلس کو تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ لگائیں کے اشارے سے گھوڑوں کو اوپر اوپر موڑ سکتا تھا۔ چنانچہ گھوڑے خود ہی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے وہ راستہ میں پڑے ہوئے پتھروں اور درختوں سے بڑی مہارت سے بچ کر نکل رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی انجلی قوت ان کی راہبری کر رہی ہو۔

ج۔ج۔ج۔ ہوا کے جھونکے چارلس کے چہرے کو ڈنسنے لگے۔ قصر برف کی سرحد کے

معن میں شاید پتھر جڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ گھوڑوں کے کھروں کی آواز بڑے زور سے گونج رہی تھی، مختلف راستے معن کے بیچ میں ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے مختلف سمتوں میں جا رہے تھے اور اندھیری محرابوں تلے جا کر غائب ہو گئے تھے۔

گھوڑوں نے ایک مختصر سا پکر کاٹا اور اب بکھی کی رفتار دھیمی پڑ گئی اور دوسرے ہی لمحے وہ قصر کے دروازے کے سامنے رک چکی تھی یہ ایک بے حد قدیم طرز کا دروازہ تھا۔ دروازوں میں گل میخیں جڑی ہوئی تھیں جو کسی زمانے میں جڑی گئی ہوں گی اور اس زمانے میں چمکدار رہی ہو گئی لیکن اب وہ رنگ آلود تھیں اور اوپر سنگین عراب تھی قدیم اور مضبوط۔

وادئ میں روتے ہوئے بھیڑیے خاموش ہو گئے چیخا ہوا لکڑھکا بھی خاموش ہو گیا۔

چاروں طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ غیر اراضی اور پرہیز چارلس نے برج کی چوٹی کی طرف دیکھا جس پر برف کی تہہ جی ہوئی تھی اور پھر ایلن کی طرف دیکھا جو بڑے غصے کے عالم میں بکھی میں سے اتر رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔ ”یہ تم پر کیا بھوت نوار ہوا کہ ہمیں یہاں لے آئے؟“

”بھوت مجھ پر نہیں بلکہ ان گھوڑوں پر سوار ہوا ہے۔“ چارلس نے جواب دیا۔

”یعنی۔“

چارلس اپنی نشست پر سے اتر کر ایلن کے قریب آکھڑا ہوا۔

”یعنی یہ کہ گھوڑوں کو میں نے لاکھ روکنے اور دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی لیکن یہ کبھت بکھی سمیت ہم کو یہاں لے آئے“ چارلس نے کہا۔ ”یہ آپ نے غلط نہیں کہا شاید ان لعنتی جانوروں پر بھوت ہی سوار ہے یا یہ بذات خود بھوت ہیں۔“

دوسری طرف تھا اور جیسے جیسے ان کی بکھی آگے بڑھ رہی تھی پہاڑیوں کے اونچے نیچے خطوط زیادہ سے زیادہ واضح ہوتے جا رہے تھے۔ برف سے ڈھکی ہوئی ڈھلان رات کے اندھیرے میں کسی پر قان زدہ کے رخساروں کی طرح زردہ مائل سفید ہو رہی تھی ہوا میں بکھی بجا رہی تھی۔ چند میل دور نظر آتی ہوئی ایک پہاڑ کی چوٹی کالے افق کے سینہ پر ایک سفید اور چمکا داغ معلوم ہوتی تھی، درختوں کے پتے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نیچے وادی میں بھیڑیے بڑی بھیاں آواز میں دوڑ رہے تھے اور کہیں دور شاید جنگل کے قلب میں کوئی لکڑھکا بھوک سے پتہاب ہو کر چلا رہا تھا۔

بلندیوں پر سے اور ٹھیک قصر کی طرف سے ایک بڑی سی چمکا ڈھنزی سے ہوا میں بہتی ہوئی آئی۔ کچھ دیر تک بکھی کے گھوڑوں کے عین سامنے فضا میں معلق رہی اور پھر چارلس کے سر سے ٹکراتی ہوئی کہیں پیچھے نکل گئی۔

بکھی ایک موڑ پر مڑی تو قصر کی کالی صیقل جیسے ایک دم سے درختوں میں سے نکل گئی۔ یہ منظر لمحے بھر تک ایک بلند چٹان کی اوٹ میں رہا۔ لیکن پھر ان کی بکھی قصر کی عظیم الشان بیرونی فصیل کی طرف بھاگی جاری تھی۔

گھوڑوں کی ٹاپیں اور بکھی کے پئے چوٹی تختوں پر بڑی لرزہ خیز آواز میں بج اٹھے چارلس نے دیکھا بکھی ایک چوٹی پل سے گزر رہی تھی یہ پل ایک کافی چوڑی خندق پر بنا ہوا تھا۔ چارلس کو خندق سے پانی پر جی ہوئی برف کی بھی ایک جھلک نظر آئی اس سے زیادہ کچھ اور نہ دیکھ سکا کیوں کہ ان کی بکھی بیرونی فصیل کے زبردست پھانگ میں داخل ہو چکی تھی۔

پھانگ کی بلند محراب میں شاید چمکا ڈھنزی بھرا کئے ہوئے تھیں کیوں کہ وہاں سے عجیب طرح کی مدھم آوازیں آرہی تھیں اس سے پہلے کہ چارلس ان کی آوازوں کی نوعیت سمجھ سکا بکھی پھانگ میں سے گزر کر قصر کے وسیع و عریض معن میں نکل آئی

”خواتین بھی تشریف لائیں۔“ وہ بولا۔

پہلے ہیلن اتر آئی۔ اس کے بشرے سے انتہائی خوف عیاں تھا، جسم جیسے پکھت
نے کے سخت ہو گیا تھا اور وہ عجیب پتھرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی
”مجھے مجھے یہ جگہ پسند نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

”اس لکڑہارے کی جھونپڑی سے تو بہتری ہے۔“ چارلس نے کہا۔
”لیکن۔۔۔“
”لیکن کیا۔؟۔“

”جب ہم یہاں آ رہے تھے تو بھیڑیے کیوں رو رہے تھے۔؟“
”ظاہر ہے کہ میں بھیڑیوں کی فطرت کا ماہر نہیں ہوں۔“ چارلس نے کہا۔
”البتہ اتنی سی بات تو کوئی بھی عقل سلیم رکھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ بھیڑیوں کو
رنے کی عادت ہی ہوتی ہے۔“
”لیکن وہ لکڑہارے؟“

”اے بھی چننے کی عادت ہے بھابی۔ آئیے۔“
”نہیں۔ چارلس نہیں“ ہیلن نے لرز کر کہا۔
”سمجھ میں نہیں آتا بھابی۔ کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے!“
”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ بے حد بھیانک مقام ہے۔“

”چنانچہ ہم کم سے کم یہی معلوم کر لیں کہ کس قدر بھیانک ہے۔“
اور چارلس دروازے کی طرف بڑھا تو نیچے وادی میں بھیڑیے ایک بار پھر دو کر
اموش ہو گئے اور بجلی میں جتے ہوئے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے نے اپنا سر
ٹھایا، اس کے آرائشی سامان کی ہلکی سی جھنکار خاموشی میں گھڑی بھر کے لئے گونج گئی،
اور پھر گھوڑے نے بوئے زور سے پھنکار کر اپنا سر جھکالیا

”چارلس! اس وقت تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور۔۔۔“ ایلن نے کنا شروع
کیا۔

”بھائی صاحب! اب تو خدا سے دعا کرو اور یہ امید رکھو کہ اس بجلی کا مالک ہم
گھوڑوں کی طرح مہمان نواز ثابت ہوں۔“

ایلن نے مشکوک نظروں سے ویران صحن کی طرف دیکھا۔
”خدا جانے یہ کیا اسرار ہے! خود تمہارا کیا خیال ہے چارلس؟۔“ اس نے الجھ کر
پوچھا

”میرے خیال میں تو یہ گھوڑے قلعی گھوڑے نہیں ہیں۔“
”تو پھر کیا ہیں؟“

”گھوڑوں کے روپ میں خواجہ خضر ہیں جو بھٹکے ہوئے مسافروں کی مدد کرتے ہر
انہیں راستہ دکھاتے اور شاید منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔“
”لیکن ہماری یہ منزل تو نہیں ہے۔“ ایلن نے کہا۔

اور اس نے اپنی نگاہیں قصر کے دروازے پر مرکوز کر دیں۔ اور چارلس کو یہ سمجھ
میں دیر نہ لگی کہ ایلن کیا سوچ رہا ہے ان کی آمد کی آوازوں سے صحن گونج اٹھا تھا
گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز، بجلی کے پیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور پھر خود ان کی باتوں کا
آواز رات کی خاموشی میں دور دور تک سنی جاسکتی تھی، چنانچہ یہ واقعی عجیب بات تھی
کہ اب تک تو دروازہ کھلا تھا اور نہ کوئی باہر آیا تھا اگر انہیں خوش آمدید کہنے نہیں
دھکے دے کر انہیں بھگا دینے کے لئے ہی کسی کو تو باہر آنا چاہئے تھا۔

چارلس نے بوئے سکون کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
”آؤ۔ بھائی، کم از کم قصر والوں کو سلام ہی کر لیں۔“
اور پھر وہ بجلی کی طرف گھوم گیا۔

باب-۳

دروازے کے دوسری طرف ایک وسیع وعریض کمرہ تھا۔ جس کی چھت بلند تھی اور جس کے انتہائی سرے پر ایک برآمدہ تھا۔ کمرے کے فرش سے برآمدے تک ایک بے حد خوبصورت اور چمکدار زینہ چلا گیا تھا۔ کمرے کی وسعت میں یہ زینہ کچھ اکیلا اکیلا سا معلوم ہو رہا تھا۔

چارلس قدم بڑھا کر اور دہلیز چلائی کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے کے فرش میں موٹے اور مضبوط پتھر بڑے ہوئے تھے اور دیواریں بھی پتھر کی تھیں۔ وہ بھی ضرورت سے زیادہ موٹی اور مضبوط معلوم ہوتی تھیں کمرے کے ایک کونے میں چھتھڑوں کا انبار تھا۔ لیکن ان چھتھڑوں پر کڑھے ہوئے نقش و نگار کے آثار اس بات کا پتہ دیتے تھے کہ کبھی یہ نہایت عمدہ پردے رہے ہوتے جو کمرے کی دیواروں کی ستر پوشی کیا کرتے ہوتے۔ ایک دیوار کی آغوش میں بڑا سا آئینہ تھا جس میں خشک لکڑیاں دھڑا دھڑلگ رہی تھیں اندھیرے کے بعد اور باہر کی سردی محسوس کرنے کے بعد آئینہ میں اٹھنے ہوئے شعلوں کا منظر اور کمرے کی گرم فضا بڑی فرحت بخش تھی اور ان انگریز مسافروں کو گویا خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

”کوئی ہے؟“

چارلس کی آواز خالی کمرے میں گونج گئی۔ کوئی جواب نہ آیا۔

”ہم لوگ مسافر ہیں۔ کوئی صاحب ہیں یہاں؟“

اس کی آواز کمرے کی تنگی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی وہ انتظار کرنے لگا لیکن کوئی نہ آیا۔

تاہم صاف ظاہر تھا کہ اس قعر میں ضرور کوئی تھا کیونکہ آئینہ میں آگ یقیناً

ایک بار خاموشی طاری ہو گئی میب اور کھل ترین خاموشی۔

چارلس نے دروازہ کے قریب پہنچ کر اپنا ایک ہاتھ دستک دینے کے لئے اٹھایا۔ لیکن ابھی اس نے کواڑ چھوا بھی نہ تھا کہ وہ بڑی آہستگی اور بڑی خاموشی سے اندر کی طرف ایک آدھ انچ کھل گیا اور روشنی کی ایک موٹی سی لکیر باہر تک آئی۔

چارلس نے گردن گھما کر ایلن کی طرف دیکھا جو اس کے عین پیچھے اور صرف چہ قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ دروازہ میں سے نکلتی ہوئی روشنی میں ایلن کا ایک رخسار داغدار تھا۔

”کیا خیال ہے۔“ چارلس نے پوچھا

”میرے خیال میں کوئی حرج نہیں۔“ ایلن نے جواب دیا۔

چارلس نے کواڑ کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ آہستہ سے کھل گیا۔



کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے، لیکن وہ خاموش رہا کیونکہ ہیلن پہلے ہی سے خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اور وہ اس کے خوف اور گھبراہٹ میں مزید اضافہ کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس کا تو اسے بھی اعتراف تھا کہ بات واقعی عجیب تھی پہلے تو بے کوجوان کی کبھی بڑے پراسرار طریقے سے آگئی۔ کبھی کے آتے ہی بھیڑیے چلانے اور لکڑھکا قہقہے لگانے لگا۔ پھر گھوڑے اس کے قابو میں نہ رہنے اور انہیں اس قصر کے دروازے پر لے آئے قصر میں شاید کوئی تھا نہیں حالانکہ چار آدمیوں کے لئے میز لگی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ بے حد عجیب اور پراسرار تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا۔ تو چارلس اس قصر میں قدم نہ رکھتا۔ لیکن اس وقت صورت حال مختلف تھی۔ وہ قصر کے صحن کے کسی کونے میں یا کبھی میں بستر لگانے سے تو رہا۔ قسمت انہیں یہاں لے آئی تھی۔ چنانچہ یہ رات اسی قصر میں بسر کریں گے یا کم سے کم اس وقت واپس نہ جائیں گے جب تک کہ قصر کے مالک سے ملکر اپنا اطمینان نہیں کر لیتے۔

وہ بے ڈھڑک آگے بڑھ کر کمرے میں پہنچ گیا اس کے ساتھی بھی قدرے شش و پنج کے بعد اندر آگئے۔ وہ لوگ دروازہ سے کئی قدم آگے بڑھ چکے تھے کہ دفعتاً ایک آواز صاف طور سے سنائی دی گھوڑوں کے ٹاپوں اور کبھی کے پتھریلے صحن پر گھومتے ہوئی پیروں کی آواز کبھی کو گھوڑے کھینچنے لگے تھے۔

حیرت اور گھبراہٹ کی ایک چیخ کے ساتھ ایلن دروازے کی طرف گھوم گیا۔ دونوں عورتوں کو دائیں بائیں ڈھکیل کر وہ دروازے کی طرف دوڑا۔ اور دوسرے لمبے وہ دروازے میں سے نکل کر ایک بار پھر رات کے اندھیرے اور سرد ہوا کے جھٹکوں میں کھڑا ہوا تھا۔

وہ پراسرار کبھی جس پر ان کا کل سلمان لدا ہوا تھا مناسب رفتار سے بھاگتی ہوئی صحن عبور کر چکی تھی اور اب اس کے انتہائی سرے پر پہنچ کر ایک اندھیری محراب کے

تھوڑی دیر پہلے جلائی گئی تھی اور پھر اس میں ابھی ابھی چند تازہ ٹکڑے رکھے گئے تھے جو اب تک سگے نہ تھے۔ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا۔ لیکن چارلس نے اب جو کمرے کا جائزہ لیا تو اسے ایک اور حیرت انگیز بات نظر آئی، آتش دان کے قریب اور ذرا ہٹ کر ایک میز لگی ہوئی تھی، اور اس پر صرف چار آدمیوں کے لئے جگہ رکھی گئی تھی۔

میز لگی ہوئی تھی، چار آدمیوں کے لئے کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں لیکن وہاں کوئی شخص نہ تھا، سوائے چارلس کے۔ پورا کمرہ خالی تھا۔ کہیں کسی جائدار کی موجودگی کے آثار تک نظر نہ آرہے تھے۔

”ہیلو۔ کوئی ہے؟“

ایک بار پھر اس کی آواز تنگی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔

”سمجھ میں نہیں آتا کیا بات ہے۔ شاید قہروالے سویرے ہی سو جانے کے عادی ہیں۔“ وہ بڑبڑایا۔

اور اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا، ہیلن اور ڈانٹا دبے پاؤں اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ اور اس کے دائیں بائیں کے کمرے میں جھانک رہی تھیں ایک طرف ایلن بھی کھڑا ہوا تھا۔

”اب یہ قصر ظاہر ہے کہ آسیب زدہ نہیں ہو سکتا اچھا خاصا ہے اور شریف انسانوں کے لئے ہے۔“ چارلس نے کہا۔

”چارلس! ہم اندر نہ جائیں گے۔“ ہیلن نے آہستہ سے کہا۔

”بھائی! آپ کو میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ بھوتوں کا مسکن نہیں ہے۔“

”بھوتوں کا مسکن ہو یا انسانوں کا اس میں کوئی خاص بات ہے۔ ہم اندر نہ جائیں گے۔“ چارلس سے ہیلن نے التجا کی۔

چارلس کا جی جاہل۔ کہ وہ کہہ دے کہ ہم اندر جائیں گے۔ اور ضرور جائیں گے

”عجیب بات ہے کہ یہاں ہماری آمد غیر متوقع نہیں ہے۔“
”کیا مطلب؟“

ڈانٹا نے چارکرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”یہاں ہم بن بلائے مسلمان نہیں ہیں۔“

”یہ کیا کہو اس کردی ہو تم؟“ ایلن نے کہا۔

”پہلے تو ہمیں جو کسی طرف مڑنی ہی نہیں بلکہ سیدھی یہاں لے آئی اور اب یہ

کھانے کی چیز جو صرف چارکروں کے لئے لگائی گئی ہے۔ اور ہم چارکرسی ہیں۔ چنانچہ

یہاں عمارا انتظار ہو رہا تھا۔“ ڈانٹا کی آواز میں حیرت تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہ تو میں نہیں جانتی لیکن میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔“

چارلس کو اپنی بیوی سے بہت زیادہ محبت تھی اور وہ اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اس

کا دل خوش کیا کرتا تھا۔ لیکن آج یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس سے اتفاق کرنے کے لئے

ذرا بھی تیار نہ تھا۔ بلکہ وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی دم میں چار بے حد بزرگ قسم کے نوگ

اس چکر دار زینے پر نمودار ہوں گے اور زینہ اتر کر خاموشی سے کھانے کی میز پر بیٹھ

جائیں گے تاہم وہ یہ بھی چاہتا تھا بلکہ اس کی دعا مانگ رہا تھا کہ وہ اپنا بچا کھانا انہیں

دے دیں۔ دھتتا۔ وہ شدید اور ناقابل برداشت بھوک محسوس کرنے لگا۔

اس نے اپنی نگاہیں چکر دار زینے پر گاڑ دیں جیسے وہ اپنی قوت ارادی سے یا سحر

سے قصر کے کینوں کو بلا لے گا جیسے وہ اپنے جسم پر اس کی نگاہوں کی عتابانہ جبین اور

اپنے دل میں اس کے بلاؤں کی عتابانہ آواز سن کر برداشت نہ کر سکیں گے اور جس

حال میں بیٹھے ہوں گے۔ اسی حال میں اٹھ کر ”بلیک“ ”بلیک“ کہتے چلے آئیں گے۔

”جلدی آجاؤ“ چارلس نے دل میں کہا ”تم جو کوئی بھی ہو جلدی آجاؤ تاکہ ہم

بچے جا کر تاریکی میں غائب ہو رہی تھی۔

ہیلن کے منہ سے ایک ہلکی نکل گئی وہ یوں کانپ رہی تھی جیسے اسے جاڑا چڑھ
آیا ہو۔

”میں جانتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ کچھ ہو گا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ہمیں

یہاں نہ آنا چاہئے“ وہ بولی۔ ”اگر تم نے میری بات سن لی ہوتی چارلس اگر وہاں

چوراہے پر تم نے میری بات مان لی ہوتی۔ تو اس وقت ہم اس مصیبت میں نہ پھنس

گئے ہوتے۔

”میری پیاری بھالی۔“ چارلس نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اگر میں نے آپ

کی بات مان لی ہوتی۔ تو اس وقت ہم انگلستان میں ہوتے۔“

”بے شک۔ اور اس میں کیا برا ہوتا۔؟“

”برا تو کچھ نہ ہوتا۔ لیکن آپ خود ہی اپنی معلومات وسیع کرنا چاہتی تھیں۔“

”اگر تم اسے ایک عظیم سیاحت یا تعلیمی سفر یا غذا جانے کیا کچھ کہتے ہو تو۔“

”اگر یہ معمر حل ہو گیا، اگر معلوم ہو گیا کہ یہ کیا اسرار ہے تو یقین کیجئے بھالی آپ

کی معلومات میں نہ صرف اضافہ ہو گا۔ بلکہ یہ سفر بھی عمر بھر یاد رہیگا ایسے عجیب

واقعات ہر ایک کے ساتھ نہیں ہوتے۔“

”یہ کیا فضول کی بحث کر رہے ہو تم دونوں“ ایلن نے کہا جو کمرے میں آگیا تھا۔

چارلس اور ہیلن خاموش ہو گئے ان چادروں نے پہلے باہر دیکھا۔ اندھیرا اور

سرد ہوا تھی۔ اوپر آتش ان کی طرف دیکھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ اور سب

سے پہلے ڈانٹا نے حرکت کی وہ میز کی طرف بڑھی وہ اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اور

میز کا جائزہ لینے کے بعد اور کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے خاموش ہو رہی۔

”کیا بات ہے؟“ چارلس نے پوچھا۔

جو شاید دونوں سے نکل کر آئی تھی۔ وہ کانپ گیا۔ اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے سامنے نظر کی اور اس دفعہ اسے کچھ نظر آیا۔ گزرگاہ کے انتہائی سرے پر کچھ دو جلتی ہوئی آنکھیں۔ وہ آنکھیں فرش سے چند انچ بلند تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چارلس کی طرف بڑھیں۔ پھر وہ اس کی طرف بھاگ پڑیں اور اس سے پہلے کہ چارلس ایک طرف ہٹ سکتا ایک غیر معمولی طور پر بڑا بلا اس کی ٹانگوں سے ٹکراتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

”اف! توبہ ہے“ اس نے اپنے خوف پر مسکرا کر ماتھے پر ہاتھ پھیرا تو وہ ٹھنڈے پینے سے غم ہو رہا تھا۔ یہ کیا حماقت ہے یاں“

وہ آگے بڑھا اور اس دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا جو گزرگاہ میں پہلا دروازہ تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دستے پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمایا۔ دروازہ مغل نہ تھا۔ دستہ گھوم گیا۔ چارلس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر دیکھا۔

یہ ایک آرام دہ کمرہ تھا، چھت سے ٹکٹا ہوا فانوس جل رہا تھا۔ آتشخان میں آگ جل رہی تھی، ایک طرف مسری تھی۔ جس پر بستر لگا ہوا تھا اور آتشخان کے سامنے کمرے کی دیواروں پر ناچ رہے تھے۔ کسی کاشب خوابی کا لباس تنہ کیا ہوا مسری پر رکھا ہوا تھا۔

چارلس اٹنے قدموں واپس لوٹ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر مسری کے ایک طرف رکھے ہوئے سوٹ کیسوں پر پڑی وہ چونکا۔ لیکن پر دل ہی دل میں بولا کہ یہ اس کا وہم تھا۔ یا پھر آتش خان میں جلتی ہوئی آگ اس کی نظر کو دھوکا دے رہی تھی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو روک نہ سکا اور کمرے میں داخل ہو کر سوٹ کیسوں پر جھک گیا۔

تمہارے قعر میں کس آنے کی معافی طلب کر لیں۔ پھر چند رسمی باتیں ہو جائیں تعارف ہو جائے اور پھر ہم سب میز پر بیٹھ کر پیٹ کی آگ بجھالیں۔ آجاؤ۔ جلدی آجاؤ۔“

اور وہ اپنے دل کی اس آواز پر آپ ہی آپ مسکرا اٹھا۔
”اول تو اس قعر میں کوئی ہے نہیں۔۔۔۔۔“ ڈانٹا نے کہنا شروع کیا۔
”نہیں کیسے ہے؟ یہ آتشخان میں جلتی ہوئی آگ اور یہ میز اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قعر غیر آباد نہیں ہے“ چارلس نے کہا۔

”اور اگر ہے“ ڈانٹا نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”تو اس سے اس مہیب اور اعصاب پر سوار ہو جانے والی خاموشی کے لئے قطعی تیار نہ تھا جو اس کی اس پکار کا جواب تھی۔

گزرگاہ بدستور خاموش رہی، دروازے بدستور بند رہے۔ کسی طرف سے قدموں کی چاپ سنائی نہ دی۔ قعر خاموش تھا۔ قبر کی طرح خاموش تھا اور اب یہ خاموشی اسے بے چین کرنے لگی تھی۔ اگر نیچے کمرے کے آتشخان میں آگ نہ جل رہی ہوتی اور اگر یہاں اس کی گزرگاہ میں شیطانی روشن نہ ہوتیں تو وہ یقین کر لیتا کہ یہ قعر عرصہ سے غیر آباد پڑا ہے، لیکن ایسی تو بات نہ تھی۔ قعر یقیناً غیر آباد نہ تھا چھر کیا وجہ تھی کہ یہاں کوئی نظر نہ آ رہا تھا؟ کیا وجہ تھی کہ اس کی پکار کا جواب نہ مل رہا تھا؟

ایک انجانا مگر موہوم سا خوف اس کے دل میں گھر کر کے لگا لیکن وہ واپس نیچے جا کر اپنے ساتھیوں کو یہ بھی بتانے کے لئے تیار نہ تھا کہ وہ بے نیل و مرام واپس آیا ہے۔

چند ثانیوں تک وہ خاموش کھڑا سوچتا رہا اور وختاً ”یوں محسوس ہوا جیسے اس گزرگاہ میں وہ اکیلا نہ تھا بلکہ کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا۔ کوئی غیر ارضی چیز کوئی روح

ہٹ گئیں۔

”آپ کا ہے؟“ چارلس نے پوچھا۔

ایلن کی زبان گنگ ہو گئی تھی چنانچہ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

چارلس کو گزرگاہ کے دوسرے دروازوں کا خیال آیا۔ وہ پلٹ کر کمرے سے نکل

آیا۔ اس سے پہلے کمرے سے چند قدم آگے دوسرا دروازہ تھا۔ اس نے اس دروازہ کا

دست ہمایا۔ پہلے دروازے کی طرح یہ بھی مقفل نہ تھا۔ چنانچہ یہ بھی کھل گیا۔ اس

کمرے کے آئینہ خان میں بھی آگ جل رہی تھی۔ اس کمرے میں بھی مسری تھی جس

پر بستر لگا ہوا تھا۔ اور اس مسری کے قریب بھی سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے۔



اب کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ اس سوٹ کیس سے جو سب سے اوپر رکھا ہوا تھا۔ وہ واقف تھا۔ یہ وہی سوٹ کیس تھا جسے وہ اس سفر میں کئی دفعہ کوچ گاڑی میں خود اپنے ہاتھوں سے رکھ چکا تھا۔ سوٹ کیس کے ڈمکن پر نام کے پہلے حروف جیلی حرفوں میں کندہ تھے۔ ”اے۔ کے“

وہ پلٹ کر کمرے سے باہر آیا۔ اور زینے کے سرے پر پہنچ گیا۔

”ایلن! ذرا اوپر آنا تو“ اس نے کہا۔

ایلن نے اپنا شوہر کو روکنے کے لئے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا لیکن وہ

اس سے بچ کر زینے تک اور پھر زینہ چڑھ کر اپنے بھائی کے پاس پہنچ گیا۔

چارلس اسے اپنے ساتھ لے کر برآمدے میں چل پڑا دروازے میں سے گزر کر

گزرگاہ میں پہنچا اور پھر ایلن کو دروازے پر لے آیا۔

وہاں پہنچ کر۔ ایلن ٹھٹھکا۔

”نہیں۔ ہم اندر نہیں جاسکتے۔“ وہ بولا۔

”کیوں؟“

”یہ کسی کی خواب گاہ ہے۔“

”لیکن کس کی؟“

”یہ میں کیسے جان سکتا ہوں۔“

چارلس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹا ہوا کمرے میں لے آیا

”یہ سوٹ کیس کس کا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

ایلن نے سوٹ کیس کی طرف دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سوٹ کیس کے

ڈمکن کو چھو کر دیکھا۔ وہ وہاں سے ہٹ کر مسری کے قریب آکھڑا ہوا اور اس پر تہ

تہ کیچے رکھا ہوا شب خرابی کا لباس اٹھا کر دیکھا اور مارے حیرت کے اس کی آنکھیں

سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس طرف دیکھنے لگا جس طرف دونوں عورتیں دیکھ رہی تھیں۔

وہاں ایک طویل القامت اور دھلا پتلا شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لمبوتر اور خشک سا تھا اور آنکھیں بڑی بڑی اور بھری ہوئی۔ وہ ہر اٹھائے سینہ تانے اور بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا۔ اس نے وجود پر جتاڑہ کا سا بالکل کالا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ ایک قدم بڑھا کر روشنی میں آگیا اور اس کے زرد اور پر شکن چہرے پر کے مروجہ سے نقوش اور بھی گہرے اور بھی ایک ہو گئے۔

”کیا مطلب ہے اس کا؟“ ایلیں نے غرا کر کہا۔

اس بھوت جیسے شخص کی خلاف توقع آمد نے ایلیں کو گویا چونکا دیا تھا اور اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کیوں کہ یہ شخص ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قبر سے نکل آیا ہو ایلیں ان لوگوں میں سے تھا جنہیں بہت کم اور کبھی کبھی غصہ آتا ہے لیکن اول تو اپنی بیوی کی چیخوں کی وجہ سے اور پھر اس احساس سے کہ اس وقت وہ بے حد خوفزدہ تھی ایلیں کو غصہ آگیا۔ ایسا شدید غصہ اور ساتھ ہی ساتھ حیرت و خوف سے ملے جلے جذبات اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔

”یعنی کیا مطلب ہے اس کا؟“ اس نے پھر پوچھا۔ اس دفعہ چیخ کر کہا۔

ایلیں نے ایسی آواز نکالی جیسے کتے کا پلا ”کوں۔ کوں“ کر رہا ہو۔

”اگر میں نے خواتین کو خوف زدہ کر دیا ہے جناب تو میں معافی چاہتا ہوں میرا مقصد یہ نہ تھا۔“

”اگر یہ مقصد نہ تھا تو پھر تم اس طرح کیوں نمودار ہوئے جیسے۔۔۔“ ایلیں نے کہا شروع کیا۔

بہن نمایاں طور پر کانپ رہی تھی اور اپنی نگاہیں اجنبی پر سے ہٹانہ سکتی تھی۔

اور یہ سوٹ کیس اور یہ سلمان خود چارلس کا تھا۔ ایلیں دروازے میں آکھڑا ہوا۔ ”یہ کیا اسرار ہے“ وہ بولا۔ ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یا تو ہمارا دماغ چل گیا ہے یا پھر۔۔۔“

ایک فلک شکاف چیخ نیچے کے کمرے میں سے بلند ہوئی۔ خاموش برآمدے میں سے گزرتی ہوئی گزر گاہ میں در آئی اور اس کی دیواروں سے ٹکرا کر خاموش ہو گئی۔ فوراً ہی دوسری چیخ سنائی دی۔

”میرے خدا! یہ ہیملن کی چیخ ہے“ ایلیں نے کہا اور گزر گاہ میں بھاگ پڑا۔ چارلس اس کے پیچھے بھاگا۔ دونوں آگے پیچھے بھاگتے ہوئے گزر گاہ میں سے برآمدے میں آگئے اور بدستور بھاگتے ہوئے زینہ اترنے لگے۔

ہیملن کمرے کے بیچ میں کھڑی ہوئی تھی اور تیسری چیخ روکنے کے لئے اس نے اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی اپنے منہ میں ٹھونس رکھی تھی۔ ڈانٹا نے اپنا ایک ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیا تھا اور وہ دونوں اس طرف رخ کئے کھڑی تھیں جس طرف کمرے کی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ چارلس زینے کے مضبوط جھگے پر دونوں ہاتھ ٹیک کر اور

درجنوں خیالات ایلن اور چارلس کے دماغ میں گھبراہٹ تھے۔ اور وہ اس پراسرار اجنبی سے سینکڑوں سوالات پوچھنا چاہتے تھے لیکن معلوم ایسا ہوتا تھا کہ یہ شخص ان کے کسی سوال کا جواب نہ دے گا۔ اور اگر دیا بھی تو اس کا جواب گول مول ہوگا۔ جو انہیں کچھ زیادہ ہی الجھاوے گا۔ چارلس کو غصہ بھی آ رہا تھا اور بے چین بھی تھا لیکن اس نے اپنے ان جذبات پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب رہا۔ اس کے علاوہ اسے اس کا بھی اعتراف تھا کہ وہ بھوکا تھا، بھوک اس کی آنتیں کھا رہی تھی چنانچہ وہ ہر جذبے پر غالب تھی اور اسے کچھ بھی سوچنے نہ دیتی تھی۔

چنانچہ اس نے اثبات میں سر ہلادیا اور اجنبی جس انداز سے اس سے نمودار ہوا تھا اس میں گھس کر غائب ہو گیا۔

”چارلس! ایلن نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔
”ہم“

”خدا کے لئے یہاں سے چلو“ وہ بولی ”ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا ہے۔“

”اس کا تو مجھے اعتراف ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے بے حد پراسرار ہے۔“

چارلس نے کہا۔ ”لیکن بھائی! میں بھوکا ہوں چنانچہ اس وقت میں کھانے کے علاوہ کسی اور چیز کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔“

”میں آپ سے متفق ہوں“ ڈانٹا نے سر ہلادیا۔

”میں ڈانٹا نہیں“ ایلن نے جلدی سے کہا۔

”کیوں؟ کیا برائی ہے اس میں؟ پندرہ منٹ پہلے کیا حالت تھی ہماری؟ ہم وہاں چورہے پر سردی میں ٹھہر رہے تھے، کسی بھی بستی سے سیلوں دور تھے اور پریشان تھے کہ کیا کریں اور کہاں جائیں اور اب ہم اس قعر میں ہیں، سردی سے محفوظ ہیں،

”اگر تم نہیں تھے“ اور یقیناً تھے تو ہماری اتنی بہت سی آوازوں کا جواب کیوں نہ دیا؟ ہم پکارتے رہے اور تم کانوں میں تل ڈالے بیٹھے رہے۔ یہ کیا مذاق تھا؟“ چارلس نے ایلن کی بات کاٹتے ہوئے کہا کیونکہ اسے خوف تھا کہ اس کا بھائی غصے میں کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جو اس اجنبی کو بری معلوم ہو۔

اجنبی کمر میں سے ڈراغم ہو گیا جیسے اسے اپنی لفظی کا احساس ہو اور اس طرح وہ معافی طلب کر رہا ہو۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی لالچی اور استخوانی انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔

”خواتین کو خوف زدہ کرنا میرا مقصد نہ تھا“ وہ بولا ”دراصل میں آپ کا سامان کبھی پر سے اتار رہا تھا اور آپ کے لئے کمرے تیار کر رہا تھا۔ امید ہے کہ اپنے کمرے آپ کو پسند آئے ہوں گے۔“

”واہ! بے حد عمدہ۔ لیکن میں سمجھا نہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ ایلن نے کہا۔

”اور نہ ہی میری سمجھ میں کچھ آیا ہے۔“ چارلس سر ہلا کر بولا۔

اجنبی کے ہونٹ کھینچ گئے اور اس کے دانت نمایاں ہو گئے اگر اس انداز سے اجنبی یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ مسکرا رہا تھا تو وہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام رہا تھا۔ کیونکہ اس کے چہرے کا یہ انداز اور ہونٹوں کا کھینچاؤ مسکراہٹ سے کوسوں دور تھا۔ چارلس نے کہا۔ ”ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ۔۔۔۔۔“

”میرے آقا کی ممان نوازی مشہور ہے۔“ اجنبی نے جلدی سے کہا۔ اول تو یہ بھی نہیں جانئے کہ تمہارے آقا کون ہیں اور چونکہ ہم ان سے واقف نہیں ہیں اس لئے۔۔۔۔۔“

”حکم ہو تو میں کھانا لگا دوں؟“ اجنبی نے کہا۔

چند ٹائیوں کے شش و پنج کے بعد وہ ایلن کے ساتھ میز کی طرف چلی دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ان لوگوں کو میز پر بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ وہی پراسرار ملازم سوپ کی سروش دار قاب لے کر نمودار ہوا۔ اس نے سوپ کی قاب میز کے سرے پر رکھ دی اور خود اپنے ہاتھ سے ان قابوں میں سوپ ڈالنے لگا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ چارلس نے پوچھا۔

”صاحب! مجھے کلیو کہتے ہیں“ ملازم نے جواب دیا۔

”ہاں تو کلیو!“ چارلس نے میز کے گرد لگی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”یہاں چار کرسیاں کیوں ہیں؟“

”اس لئے صاحب آپ چار ہی ہیں۔“

”میرا مطلب یہ نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ تمہارے آقا کھانے میں شریک نہیں ہو رہے ہیں؟“

”جی نہیں صاحب“

”کیوں؟ یہ تو اصول میزبانی کے خلاف ہے“

”جی ہاں صاحب“

”تو پھر کیوں شریک نہیں ہو رہے؟ ان کی طبیعت کچھ نامناسب ہے کیا؟“

”جی نہیں“

”پھر کیا بات ہے؟“

کلیو ان کی پلیٹ میں سوپ رکھ چکا تھا چنانچہ اب وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اور اب اس نے چارلس کے سوال کا جو جواب دیا وہ کسی کو بھی چونکا دینے کے لئے کافی تھا۔ اس نے کہا۔

”ہمارے لئے کمرے تیار کر دیئے گئے ہیں۔ ہمارے لئے کھانا چنا جا رہا ہے اور اگر اس پراسرار ملازم کا آقا ایسا ہی ہوا جیسا کہ میں سمجھ رہی ہوں تو پھر ہماری تفریح طبعاً سامان بھی ہو جائے گا۔“

”اور تم اسے کیا سمجھ رہی ہو؟“

”ایک بے حد اڑاؤ قسم کا نواب جو لوگوں کو حیرت زدہ کر کے محفوظ ہوتا ہے اور پھر اپنی مہمان نوازی کا سکہ جمانے کے لئے انہیں خوب کھلاتا پلاتا ہے اپنی تعریف کروانے کے لئے انہیں ہر طرح سے آرام پہنچاتا ہے۔ مطلب یہ کہ بے دریغ دولت لٹانے والا اور خوشامد پسند نواب۔ تم جانو دنیا میں اب بھی ایسے سکی مگر دلچسپ اور باذائق لوگوں کی کمی نہیں۔“

”آؤ بھی میز پر بیٹھ جائیں۔“ چارلس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اگر بحث کرنا ہے تو میز پر بیٹھ کر ہوگی۔“

ایلن نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے میز تک لے آئے لیکن وہ اپنی جگہ پر جم رہی۔ ایلن نے اسے کھینچنے کی کوشش کی تو وہ کانپ کر بولی۔

”ایلن نہیں۔“

”ہیلن! آج یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے!“ ایلن نے الجھ کر کہا۔ ”تم ایسی تو نہ تھیں آج تو کچھ خوف زدہ نظر آتی ہو حالانکہ پہلے میں نے تمہیں کبھی خوف زدہ ہوتے نہیں دیکھا۔“

”ایلن! میرا دل کتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے کوئی بھیانک واقعہ“

”کچھ ہونے والا نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم ڈٹ کر کھائیں گے گہری سوئیں گے، صبح حسب وعدہ وہ تالائق کوچوان ہمیں لینے آجائے گا اور ہم ردا ہو جائیں گے۔ آؤ۔ آؤ بھی۔“

”صاحب! میرے آقا کا انتقال ہو چکا ہے۔“

آتشدان میں جلتی ہوئی آگ کی گرمی کے باوجود چارلس کے رگ دریٹے میں سردی کی لہر دوڑ گئی اس کا پورا جسم ہلکا ہو گیا۔ جیسے کوئی نظر نہ آنے والا دروازہ کھل گیا ہو۔۔۔۔۔ لیکن یہ دروازہ اس دنیا میں نہ کھلا ہو۔ بلکہ کوئی بے حد سزا اندھیری اور پراسرار دنیا میں کھل گیا ہو۔ جہاں سے غیر ارادی ٹھنڈک کی لہریں آ رہی ہوں۔ کلیو نے یہ الفاظ کچھ ایسے ٹھنڈے پنے سے کہتے تھے اور خود کلیو ایسا پرسکون تھا کہ پورا ماحول ہی پراسرار خوف زدہ کر دینے والا بن گیا تھا۔

”کلیو! یہ سب کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آیا اگر تم چاہو تو ہمیں بے وقوف کر سکتے ہو۔“ چارلس نے اپنی کانپتی ہوئی آواز کو راہ پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن اگر مناسب سمجھو تو ہمیں بتادو کہ ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟“

”کن باتوں کا صاحب“

”یہ۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ کھانے کی میز جو صرف چار آدمیوں کے لئے لگائی گئی۔۔۔۔۔ اور کمرے جو تیار ہیں ہمارے لئے۔۔۔۔۔ اور وہ تبھی جو ہمیں لینے آئی تھیں وغیرہ۔“

کلیو نے کھٹکھٹا کر اپنا گلا صاف کیا اور کھانے کی میز پر بیٹھنے والوں کی طرف دیکھا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ وہ تقریر کرنے والا ہے بالکل اسی طرح جس طرح خاص دعوت میں میزبان کھانے کے بعد تقریر کرتا ہے۔

”صاحب!“ وہ بولا ”جیسا کہ میں نے کہا میرے آقا کا انتقال ہو چکا ہے لیکن ان کا حکم تھا کہ اس قصر کو ویران نہ ہونے دیا جائے بلکہ اسے ہمیشہ صاف ستھرا رکھ جائے اور جو بھی یہاں آئے اس کی خاطر ہدایات کی جائے۔“

چنانچہ صاحب یہ قصر کسی بھی مہمان کے لئے کھلا ہے اور میں اپنے آقا کے

حکم کی تعمیل کر رہا ہوں اور اسی لئے آپ کو یہاں لے آیا ہوں۔“

”بڑے وفادار ملازم ہو تم۔ خیر تو کون تھے تمہارے یہ مرحوم آقا جن کی یہ آخری خواہش تم پوری کر رہے ہو؟“ کیا نام تھا ان کا۔؟“

کلیو نے اپنی جگہ ہلکی گھونٹائی اپنی نظریں اٹھائیں اور اب وہ آتشدان کے ماتھے پر دیکھ رہا تھا۔ وہاں دیوار میں چسپاں زدہ بکتر جو غالباً خاندانی علامت تھی۔

”میرے آقا کا نام“ کوئٹ ڈریگولا تھا۔“

”کوئٹ ڈریگولا۔“

”جی ہاں وہ ایک قدیم اور مشہور خاندان کے فرد تھے یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ان کی خدمت کا شرف حاصل ہوا۔“

”اب اس خطاب کا حامل کوئی نہیں ہے۔“

”جی نہیں! انہوں نے اپنے پیچھے کسی کو نہیں چھوڑا ہے جیسا کہ عام خیال ہے۔ اب میں معافی چاہوں گا۔“

وہ پلٹ کر جس طرف سے آیا تھا۔ اسی طرف چل دیا۔

ڈانکا نے کہا۔ ”انہوں نے اپنے پیچھے کسی کو نہیں چھوڑا ہے والی بات تو سمجھ میں آئی ہے اور صاف بھی ہے لیکن۔۔۔۔۔ جیسا کہ عام خیال ہے کہنے سے کلیو کا کیا مطلب تھا؟“

”ایک اور سوال جس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔“ چارلس نے سوچا۔

وہ سوپ کی قاب پر جھک گیا اور چمچ میں لے کر اسے چکھا اور فوراً ہی چٹکارہ لے کر اپنا سر ہلا کر سوپ بے حد لذیذ تھا اور اس نے دیکھا کہ ڈانکا، ایلن اور ہیلن کو بھی سوپ پسند آیا تھا۔ چنانچہ وہ حل طلب مسائل کو بھول کر سوپ سڑپنے میں مصروف تھے اس پر پراسرار تبسمی، قصر اور اس کے پراسرار ملازم کلیو کے متعلق ان کے دماغ

جیسے ہوئے تھا کہ ہم یہاں سردی میں ٹھہرتے رہیں گے لیکن اس کے برخلاف ہم یہاں بیٹھے مزے سے کھانا کھا رہے ہیں۔

”وہ خوفزدہ تھا۔“ ہیلن نے کہا۔

”خوفزدہ تو تم سب ہی تھے لیکن۔۔۔ چارلس نے کہا۔

”خوفزدہ ہی نہیں بلکہ وہ سا ہوا تھا اور انتہائی خوف سے پاگل ہو رہا تھا۔ جیسے

اسے پتا ہو کہ یہاں کوئی بھی ایک چیز ہو۔“ ہیلن نے کہا۔

”لیکن اس سے تو کسی کو انکار نہ ہوگا۔“ چارلس نے ہیلن کی بات سنی ان سنی

کر کے سلسلہ کلام جاری رکھا ”جب کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے کہ اس کا کوئی سربراہ

سمجھ میں نہیں آتا تو آدمی گھبرا جاتا ہے اور خوفزدہ بھی ہو جاتا ہے۔ یہ گویا فطری بات

ہے۔ تاہم بھائی اس سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ وہاں اس لکڑھارے کی

جموہوری میں ہم جو کھانا کھاتے وہ اتنا لذیذ نہ ہوتا جتنا یہ کھانا لذیذ ہے جو ہم اس وقت

ٹھونس رہے ہیں۔“

”میں اب بھی خوف زدہ ہوں“ ہیلن پہلے کی طرح اعصابی بیہوش میں اب بھی جلا

معلوم ہوتی تھی تاہم اس کا حالیہ سکون کچھ زیادہ ہی بے چین کر دینے والا تھا۔ اس

قصر میں کوئی خاص بات ہے جو۔۔۔“

چارلس ایک بار پھر اس خیال سے بے چین ہونے لگا تھا کہ ہیلن پھر ہسٹریا کی

مرضیہ کی طرح چیخنے چلانے لگ جائیگی لیکن یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ

ایلن نے آگے کی طرف جھک کر اپنی بیوی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ابتداء میں ان

دلوں کے درمیان جذباتی رشتہ رہا ہوگا لیکن اب ان کے درمیان جو خشک مگر وفادارانہ

رشتہ قائم ہو چکا تھا وہ قابل احترام تھا بہت ممکن تھا کہ اب ان دونوں میں وہ تعلقات

قائم نہ ہوتے ہوں جو میاں بیوی کے لئے لازم و ملزوم ہیں تاہم جذباتیت کا ابتدائی دور

میں جو خیالات چکر لگا رہے تھے وہ اس وقت دماغ کے کسی تاریک گوشے میں عارضی

طور پر جا بسوئے تھے۔ کونٹ ڈریکولا سے واقف نہ تھے۔ بلکہ انہوں نے اس کا نام بھی

نہ سنا تھا اور پھر جو کہ وہ مرچکا تھا اس لئے اس کے متعلق سوچنا حماقت تھی۔ یہ سب

کچھ اسرار سی جو ان لوگوں کو ایک افسانہ معلوم ہوتا تھا۔ اتف لیلہ کی وہ داستان

معلوم ہوتی تھی جس میں ماسکی کو بادشاہ بنادیا جاتا۔ لیکن یہ نہ افسانہ تھا اور نہ داستان

بلکہ حقیقت تھی۔ کہ وہ کھانے کی میز پر بیٹھے تھے اور گرم و لذیذ سوپ پی رہے تھے

چارلس نے چچہ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں کل صبح ہمیں مل جل جائے گا۔“

”مل۔! کاہے کاہل؟“

”قیام و طعام کا۔ اور کاہے کا۔“

ڈانکا کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ کلیو نے یہ اعلان کر کے کہ قصر کے آقا کا انتقال

ہو چکا تھا۔ اس کے اس حسین تصور کے تار و پود تو پہلے ہی سے بکھیر دیئے تھے کہ اس

قصر کا پراسرار مالک بے حد فیاض اور مہمان نواز قسم کا اور کوئی سکی فیض ہوگا اس کے

باوجود یہ یقین کرنے کے لئے قطعی تیار نہ تھی کہ دوسرے دن انہیں قیام کرنے اور

کھانے کا بل مل جائے گا۔

”ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔“ وہ بولی۔ ”بہت عرصہ فیض ہوگا یہ کونٹ ڈریکولا کہ

اپنے وصیت نامہ میں یہ لکھ گیا کہ اس قصر کو مسافروں کے لئے کھلا رکھا جائے اور ان

کی خاطر مدارات کی جائے۔“

”لندن وغیرہ میں یہ بات ممکن ہے ہی نہیں۔ بہر حال معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں

الف لیلہ کے شہزادوں کی قسم کے نواب اب بھی موجود ہیں۔“ چارلس نے کہا اس

کوچوان نے ہمیں چوراہے پر بیٹھ دیا تھا تو یہ گویا نادانستہ طور پر وہ ہم پر کرم کر گیا تھا۔ وہ

بولے؟“ جیلن نے کہا۔

”اب یہ تو میں نہیں جانتا“ تاہم حقیقت یہی ہے۔“

اس کے باوجود چارلس نے یہی سوچا تھا کہ چونکہ قادر شیشور ایک خانقاہ میں اور سب سے الگ تھمک رہتا ہے اس لئے کبھی کبھی اس کا دل بھی تو دنیا دار لوگوں سے ملاقات کرنے کو چاہتا ہوگا۔ وہ بھی چاہتا ہوگا کہ بیرونی دنیا کے کچھ لوگ اس کی خانقاہ میں قیام کریں۔ تاکہ وہ عبادت اور دنیا کی عارضی طور پر بھول کر ان مسلمانوں سے دنیا کی بدلتی ہوئی حالت پر تبادلہ خیال کرے کیونکہ چارلس نے سوچا۔۔۔ قادر شیشور کی باتوں سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسرے راہبوں کی طرح زاہد خشک نہ تھا۔ غالباً بلکہ یقیناً یہی وجہ تھی کہ اس لئے ان لوگوں کو اپنی خانقاہ میں آنے اور قیام کرنے کی دعوت دی تھی۔

”میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم یہاں آگئے، چارلس نے کہا۔ اگر خانقاہ میں جاتے تو دنیا کی متعلق لکچر سننے پڑتے یہاں نہ تو راہب ہیں نہ براہر نہ عبادت اور نہ ہی دنیا کی متعلق تقریر بازی اور یہ سب کچھ مرحوم کوٹ کے طفیل ہے۔ چنانچہ ہم مرحوم ڈرکولا کے نام کا جام پیتے ہیں۔ خدا اسے کوٹ کوٹ جنت نصیب کرے۔“

”یہ الفاظ اس کی زبان نے ادا کئے ہی تھے کہ بغیر کسی تنہید کے ایک کڑک کی آواز کہیں اوپر سے سنائی دی جو بڑی تیزی سے لڑھکتی ہوئی نیچے آئی اور غالباً یہ کلی تھی۔ جو قصر کی چھت پر گری اور قصر اوپر سے نیچے تک اُل گیا۔ کڑک کی آواز خاموش ہوئی تو کسی نظر نہ آنے والے پرند کے بازوؤں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز ابھری۔ یہ شاید پگڈاڑ تھی۔ ساتھ ہی نیچے واوی میں بھیڑیے دو ایک دفعہ رو کر خاموش ہو گئے۔ اور آتش دان میں جلتی ہوئی آگ کے شعلے گھڑی بھر کے لئے یوں جھک گئے جیسے کسی کو

گزر جانے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے حقیقی محبت کرتے تھے۔ اور جنسی تسکین کا دور گزر جانے کے بعد بہت کم جوڑوں میں یہ مقدس رشتہ قائم رہتا ہے۔“ شروع میں یہ سب باتیں بے حد عجیب معلوم ہوئی تھیں۔“ ایلن نے اپنی بیوی کو تسلی دی۔ لیکن اب سب باتیں سمجھ میں آگئی ہیں۔ چنانچہ گھبرائے اور خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دنیا میں اکثر دفعہ ایسے حیرت انگیز واقعات ہوتے ہیں۔ چنانچہ انسان کو انہیں قبول کر لینا چاہئے اور۔۔۔۔۔۔“

جیلن نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ گھسیٹ لیا۔
”خدا جانے کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کی عقلوں کو۔“ وہ بولی۔ ”یہاں جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ اچھا نہیں ہو رہا۔۔۔۔۔۔“

”اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی کہ ہمیں رات گزارنے کے لئے یہ قصر اور پھٹ کی آگ بجھانے کے لئے گرم گرم کھانا مل گیا۔“ چارلس نے کہا۔
”ہم لوگوں کی محل پر تو ایسے پتھر پڑے ہیں کہ تم یہ بھی بھول گئے کہ۔۔۔۔۔۔“

جیلن نے کہا

”کیا بھول گئے۔؟“

”یہ بھی بھول گئے کہ قادر شیشور نے کیا کہا تھا؟۔۔۔۔۔۔ بھولے سے بھی قصر کے

قریب نہ جانا۔ یاد ہے۔؟ یہ بھی بھول گئے۔؟“

”قادر شیشور!۔ آہ۔ ہاں۔ یہ تو اس نے اس لئے کہا تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ ہم بحر محل کیلن برگ چلے چلیں اور وہاں پہنچ کر اس کی خانقاہ میں قیام کریں“ چارلس نے کہا اور اس لبرز جام کی طرف ہاتھ بڑھایا جو سوپ کی خالی قاب کے قریب دھرا ہوا تھا۔

”انہیں کیا ضرورت تھی۔ کہ ہمیں اپنی خانقاہ میں بلائے کے لئے جھوٹ

باب - ۴

سجدہ کر رہے ہوں یا جیسے کسی دیو نے دوسری طرف سے ان پر پھونک دیا ہو۔

لیکن قصر کے کمرے میں کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے مسافروں نے ان باتوں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ایلن اور ڈائنا نے قدرے شش و پنج کے بعد اپنا اپنا جام اٹھایا۔

”کونٹ ڈریکولا۔“ ڈائنا نے اپنا جام بلند کر کے کہا اور اس کی آواز کھوں کی وسعتوں میں گھوم گئی۔

اور فوراً ہی قصر کا پراسرار ملازم جس نے اپنا نام کلیو بتایا تھا قصر کی اندرونی اور انجانائی گزر گاہوں میں سے نکل آیا۔ کسی نے اسے آتے نہ دیکھا۔ اور کسی نے اسے آتے نہ سنا۔ وہ خاموشی سے آیا اور میز پر سے سوپ کی قلمیں اٹھا کر پشتی میں رکھنے لگا۔ لیکن اتنی مہارت سے کہ چینی کے برتنوں کی بھی ٹکٹھناہٹ پیدا نہ ہوئی۔ کلیو کا چہرہ پتھر کے بت کے چہرے کی طرح ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا کلیو نے مہمانوں کی طرف دیکھا۔ چارلس، ایلن اور ڈائنا اپنے اپنے جام میز پر رکھ چکے تھے۔

”کونٹ ڈریکولا۔“ ایلن نے سر ہلا کر کہا۔

لیکن کلیو کی نگاہیں۔ ایلن کے جام پر مرکوز تھیں اس کا جام میز پر ہی دھرا ہوا تھا اور بدستور لبریز تھا اس نے دوسروں کے ساتھ نہ تو جام اٹھایا اور نہ ہی کونٹ ڈریکولا کے نام کا جام پیا تھا۔

ایک عرصہ گزر چکا تھا ایک طویل مدت ہو چکی تھی ایک دور ختم ہو چکا تھا اور وہ انتظار کرتا رہا تھا۔ انتظار یہ عرصہ بے حد طویل تھا دس سال، جو انہیں دس صدیاں معلوم ہوئے تھے۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ کونٹ ڈریکولا کا نام سننے ہی وادی کے لوگ لرز اٹھتے تھے ہاں وہ دور بھی تھا کہ جب کلیو کالے گھوڑوں والی بگھی میں بیٹھ کر بہتی میں جاتا تھا۔ تو مائیں اپنے بچوں کو گھسیٹ کر سینے سے لگا لیتی تھیں، عورتیں کانپ کر گھروں کے کونوں میں دبک جاتی تھیں ڈریکولا کے نام کی دھماک جیٹھی ہوئی تھی، اس کی ہیبت ہر مل پر طاری تھی وہ زمانہ بھی تھا جب بہتی سے آئے دن بچے غائب ہو جاتے تھے۔ اور پھر ان کے رونے کی آواز قصر ڈریکولا کے کسی کمرے میں سنائی دیتی تھی، جب اچانک لڑکیوں کی شہ رگ پر دو نشانات نمودار ہو جاتے تھے اور پھر وہ لڑکی سفید ہونے لگتی تھی کیوں کہ ڈریکولا اس کا خون نیا کرتا تھا۔ اور پھر قبریں، اپنے وحلے کھول دیتی تھیں اور مرنے والیاں چیل بن کر اپنی قبروں سے نکل آتی تھیں۔ اور بہتی سے بچے غائب ہونے لگتے تھے اور لوگوں کے دلوں میں کونٹ ڈریکولا کی ہیبت شدید سے شدید تر ہو جاتی تھی

لیکن اب وہ زمانہ گزر چکا تھا دس برس ہوئے کہ ایک منحوس شام اور سوچ غروب ہونے سے پہلے جتنا تھن ہار کر، کوئی، ڈاکٹر سیورڈ اور آر تھریابی چار لہنتی انگریزوں نے کلیو کے آقا، کونٹ ڈریکولا کا خاتمہ کر ڈالا تھا، اور اس منحوس شام کے بعد حالات کا رخ بدل گیا تھا۔ کیوں کہ اب کونٹ ڈریکولا نہ رہا۔

تاہم اس کی ہیبت وادی کے لوگوں کے دلوں پر اب بھی طاری تھی چنانچہ لوگوں کا

زیب پہنچ گئے تھے ایک انگریز نے جس کا نام جتا قن تھا۔ پھڑپھڑے پر چڑھ کر تابوت
نے لٹکا دیا تھا اور ان لوگوں نے تابوت کا ڈھکن کھول کر ایک طرف پھینک دیا تھا
اور اس تابوت میں کلیو کا آقا ڈر نکولا دراز تھا۔ اسی انگریز نے جس کا نام جتا قن تھا اپنا
ہاتھ اٹھ کر ڈر نکولا کے حلق میں اتار دیا تھا۔ اور پھر اسے گھسیٹ کر وہ ظالم ڈر نکولا کو
بیچ کر لے گیا تھا اور دوسرے انگریز کا چاقو اس وقت ڈر نکولا کے سینے میں اتر گیا تھا اور
جب کونٹ ڈر نکولا کا جسم ریزہ ریزہ ہو رہا تھا اس وقت کلیو نے جو ان خانہ بدوشوں کے
ساتھ تھا اپنے دل میں کونٹ کے یہ الفاظ سنے تھے کہ:

”ایک وقت آئے گا“ کلیو“ جب میں دوبارہ اٹھوں گا ایک بار پھر میری حکومت
ہوگی اور ایک بار پھر میرا دور دورہ ہوگا۔ ایک بار پھر لوگ میرا نام سن کر لرزے اور
کاٹنے لگیں گے“ تم میرا قصر آباد رکھو“ اس وقت کا انتظار کرو وہ ضرور آئیگا اور جب وہ
وقت آئے گا تو میری ان ہدایتوں پر عمل کرنا۔“

اور تب کلیو نے اپنے دل میں چند عین سنی تھیں اور اس دن سے لے کر اب
تک وہ اس وقت کا منتظر رہا تھا۔ جس کا وعدہ اس کے آقا نے کیا تھا۔ اور وہ بے حد
طویل اور صبر آزما انتظار تھا یہ۔

لیکن اب وہ وقت آگیا تھا۔ آج کی رات تمام باتیں ایسی ہی ہوئی تھیں جیسی کہ
کونٹ نے کہا تھا۔ کئی برسوں سے کوئی اس قصر کے قریب تک نہ آیا تھا۔ لیکن آج
رات چار انسان نہ صرف یہاں آئے تھے بلکہ قمر کی موٹی موٹی دیواروں کے اندر تھے
اور پھنس گئے تھے۔ لیکن انہیں پتہ نہ تھا کہ وہ کس جال میں پھنس گئے تھے۔ انہیں
معلوم نہ تھا کہ کیا ہونے والا تھا۔ انہیں ذرا بھی شک نہ ہوا تھا۔ کیوں کہ ان چاروں
مٹا سے کسی ایک نے بھی فرار ہونے کی کوشش اب تک تو نہ کی تھی۔ وہ یہیں تھے
اکی قمر میں تھے اور وہ وقت آگیا تھا جس کا انتظار نہ صرف کلیو کو بلکہ کونٹ ڈر نکولا کو

یہ حال تھا کہ جب کبھی کلیو کالے گھوڑوں والی بٹھکی میں سوار ہو کر بستی میں جاتا تو اس
کے سامنے احرام سے جھک جاتے تھے یا پھر خوف سے سنٹ کر اوپر اوپر ہٹ جاتے
تھے یا دبک جاتے تھے“ لیکن کلیو اب زیادہ باہر نہ جاتا تھا کیونکہ اسے احساس تھا کہ
لوگوں کے دلوں سے ڈر نکولا کا خوف رفتہ رفتہ دور ہو چلا تھا۔ اور اب خود کلیو کے لئے
یہ خیال سوہان روح بنا ہوا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں کے دلوں سے اس کے آقا
ڈر نکولا کا خوف بالکل ہی جاتا رہے اور وہ کلیو پر حملہ کرنے کی ہمت کر بیٹھیں اگر ایسا
ہو تو پھر اسے کوئی نہ بچا سکے گا۔ کیونکہ اب اس کا آقا نہ رہا تھا“ ظلمت کا وہ دیوتا مٹی
بن چکا تھا جس کے نام سے ایک ظالم لرز رہا تھا“ اگر ایسا ہو کہ لوگوں نے کلیو کو قتل کر
دیا تو پھر یقیناً وہ لوگ قصر ڈر نکولا پر بلہ بول دیں گے اور انہیں روکنے والا کوئی نہ
ہوگا۔ لیکن شکر ہے کہ لوگوں کو اب تک یہ احساس نہ ہوا تھا۔ چنانچہ ٹھیک ہی تھا
کہ وہ پرانا شدید خوف اب تک ان کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ یہ ٹھیک ہی تھا کہ وہ
اب تک پرانی باتیں نہ بھولے تھے اور نہ بھولے تھے کہ چاندنی راتوں میں سیمیں
ذرات قیمتی لگتی ہوئی چٹیلوں میں تبدیل ہو جاتے تھے اور نہ یہ بھولے تھے کہ رات
کے اندھیرے میں کئی قبریں اپنے دہانے کھول دیتی تھیں اور ان میں سے ڈر نکولا کی
وانہیں نکل آتی تھیں۔ ہاں۔ وہ لوگ یہ باتیں نہ بھولے تھے چنانچہ وہ اب بھی قمر کی
طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ڈرتے تھے۔ اور اب بھی ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ کرتے تھے۔
اور کلیو اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جو آنے والا تھا۔ کیونکہ اس کے آقا نے کہا
تھا کہ وہ وقت آئے گا“ اور ضرور آئے گا۔ کلیو کو یاد تھا کہ اس منحوس شام کو جب
خانہ بدوشوں کا ایک گروہ ایک پھڑپھڑے میں تابوت لادے قمر کی طرف لا رہا تھا“ تو کیا
ہوا تھا۔ اسے یاد تھا کہ چار انگریز اس پھڑپھڑے کا تعاقب کر رہے تھے۔ انہوں نے اسے
جالیا تھا اور پھر وہ خانہ بدوشوں سے لڑتے بھڑتے اور ان کا حلقہ توڑ کر پھڑپھڑے کے

پہلے۔ کچھ جگہ میں اور کچھ سوتے میں کوئی سولہ پوچھا گیا اور پھر کوئی پوری طرح بیدار ہو گیا۔

ایک عورت کی آواز نے پوچھا۔

ایلیں! اٹھو! کیا تھا وہ؟

”ہوں۔ اوں۔ کیا بات ہے؟“

”ایلیں! اٹھو بھی۔ کسی نے میرا نام لے کر پکارا تھا۔“

”ارے نہیں۔ خواب دیکھا ہو گا۔ سو جاؤ۔“

”ایلیں! خدا کے لئے اٹھو۔“

”یعنی یہ کیا حماقت ہے کہ۔۔۔“

”سچ کہتی ہوں، کسی نے مجھے پکارا تھا۔“

”پکارا ہو گا۔ سو جاؤ اب۔ چپ۔“

”نہیں۔ خدا کے لئے اٹھو اور جا کر دیکھو یا ہر۔۔۔“

”یہ عجیب مذاق ہے بھی۔“

لیکن نہیں۔ یہ مذاق نہ تھا۔ گزرگاہ میں سے کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ یہ کلیو تھا جو پڑی تیزی سے چلتا ہوا گزرگاہ کے انتہائی سرے پر پہنچ گیا تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے پورا قصر دفعتاً بیدار ہو گیا ہو۔ لیکن یہ لوگ اس صبح کے حلق کیا جانتے تھے یا جان سکتے تھے؟ ہاں یہی ہے وقف لوگ جو آج رات قصر میں بندے سکون اور اطمینان سے سو رہے تھے؟ ڈرکیلا کا نام ان کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا قصر ان کے لئے ایک ہوٹل کی طرح تھا جہاں انہیں رات گزارنے کے لئے کمرے مل گئے تھے۔۔۔ قصر کے زندہ مردہ مالک کے وجود سے یہ لوگ بے خبر تھے اور کلیو اسی قصر کے زندہ مردہ مالک کا ملازم تھا۔ اور اس پر اسے فخر تھا۔

بھی تھا۔ کونٹ انہی مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں آج رات کونٹ ڈرکیلا کی پیاس بجھائی جائے گی۔ اور پھر وہ ہو گا۔ جو کسی کے وہ مکان میں بھی نہ تھا۔

نیچے وادی میں بھیرے چلا رہے تھے۔ بھیرے، جنہیں کونٹ ڈرکیلا نے ”شہر“ کہا تھا۔ جن کی آواز اسے بہت پسند تھی اور جو اس کے تال فرما رہے تھے۔ یہ بھیرے خوشی سے چلا رہے تھے کیونکہ آج ہی رات کو وہ معجزہ ہونے والا تھا۔ کا وعدہ عظمت کے دیوتا نے کیا تھا۔

اور قصر کی ایک گزرگاہ میں کلیو ٹپل رہا تھا اور ماضی کی تصویریں یکے بعد دیگرے نظر کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ ماضی۔۔۔ جو اب مستقبل بن جائے گا ماضی! تھا، حال برا رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کا آقا مجسم ہو گا وہ پھر سینہ گیتی پر چلتا پھرتا آئے گا۔ اس قصر میں ایک بار پھر اس کی فراہم اور اس کی دہنوں کے قہقہے گونجیں گے۔ پھر وہی خون اور عظمت کا دور شروع ہو گا۔ خون۔۔۔ جو اس کے آقا کی ماں ہے۔ اور عظمت۔۔۔ جس کا دیوتا ہے۔ اس کا آقا۔ بھیروں کی چیخوں سے اور چمکاؤروں کی ہمز ہماہٹ سے یہ وادی پھر آباد ہوگی۔ کیونکہ اب وہ وقت آیا تھا۔ کلیو ٹپلتے ٹپلتے دیوار کے حلقے میں اٹھی ہوئی ایک مشعل کے قریب رک گیا۔

”ایلیں!“ اس نے آہستہ سے کہا۔

کچھ دیر تک وہ اسی جگہ کھڑا رہا، پھر وہ آگے بڑھا اور اب وہ ایک بند دروازے کے قریب کھڑا تھا۔

”ایلیں!“ اس نے ایک بار پھر کہا۔

اور فوراً ہی بند دروازے کے پیچھے والے کمرے میں سے سرسراہٹ کی ہلکی آواز سنائی دی، کسی نے بستر پر کھوٹ بدلی تھی، ایک جمالی لی گئی، کوئی نیند میں کچھ:

”چراؤں۔“ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور کلیو جلدی سے کچے ہٹ کر چھپ کر
الین دروازہ کھول کر باہر گزر گاہ میں آگیا اس نے اپنے ایک ہاتھ میں موسم بقی اٹھارہ
تھی اور وہ خود مسلسل جھانپاں لے رہا تھا۔

وہ بڑا سا ٹنک اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ سال سے وہ اسی جگہ دھرا ہوا تھا
اور وہ بھی گویا اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا یہ ٹنک ایک غیر معمولی طور پر بڑا سنا
صندوق معلوم ہوتا تھا جس میں کانٹس کے قلابے اور تالے لگے ہوئے تھے۔ بظاہر اس
میں کوئی خاص بات نہ تھی لیکن کلیو جانتا تھا کہ اس صندوق میں کون سا خزانہ بندوق
صرف وہ جانتا تھا کہ اگر حالات اس کے موافق ہوئے اور قسمت نے ساتھ دیا تو کم
ہوگا۔ اگر ڈریکولا کی ہدایتوں پر صحیح طور سے عمل کیا گیا۔۔۔ اگر صندوق کا ڈمکر
کھولا گیا اور وہ الفاظ کے گئے۔ اور حیات بخش سیال پیش کیا گیا تو کیا ہوگا۔۔۔ اس
سے صرف کلیو واقف تھا۔۔۔ مٹی جسم بن جائے گی۔ عدم وجود میں تبدیل ہو جائے
گا۔ اور حقیر اور بے مصرف زندگی عظیم بن جائے گی۔ کلیو نے صندوق کا ایک طرف
پکڑا اور اسے کھینچا ہوا گزر گاہ کے آخری سرے تک لے آیا۔ پیچھے سے گزر گاہ میں
سے حیلوں کی چاب سنائی دے رہی تھی جو اسی طرف بڑھ رہی تھی۔۔۔ آہستہ آہستہ
اور احتیاط سے لیکن کلیو نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ الین نے اسے صندوق
کھینٹ کر اس طرف لاتے دیکھ لیا تھا۔ اور اب وہ شوق تجسس سے بیتاب ہو کر اس
کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ لیکن کلیو خوفزدہ نہیں بلکہ مطمئن اور خوش تھا کیوں کہ وہ کیا
چاہتا تھا۔

اپنے قیمتی بوجھ کی وجہ سے کلیو بیٹہ بیٹہ ہو رہا تھا لیکن اس نے شکایت نہ کی۔
اس کی رفتار دھیمی ہو گئی اور یہ صندوق کا بوجھ نہ تھا۔ جس نے کلیو کی رفتار کم کر دیا
تھی، نہیں، بلکہ اس نے قصداً ایسا کیا تھا کہ وہ جو اس کا تعاقب کر رہا تھا، راستہ میں

سے ہی لوٹ نہ جائے۔ ہاں کلیو یہ نہ چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ چند ثانیوں تک جہاں تھا وہیں
کھڑا انتظار کرتا رہا، یہاں تک کہ اسے یقین ہو گیا کہ الین اب اس کے بہت قریب
پہنچ گیا تھا اور اب اس نے دیوار پر لٹکے ہوئے ایک پردے کو ہٹایا اور صندوق کو ایک
جگہ کے ساتھ اس کے پیچھے کھسٹ لیا۔ پردے کے پیچھے دیوار میں ایک دروازہ تھا۔
اس نے وہ دروازہ کھول کر اور اپنا وہ سرا ہاتھ بڑھا کر اس نے پردے کو ایک آخری
جھٹکا دیا، تاکہ وہ اس وقت تک ہٹا رہے جب تک کہ وہ سادہ لوح اور احمق انگریز اس
کے قریب نہیں پہنچ جاتا، جو اس کا تعاقب کر رہا تھا اور جس کے لئے ایک خاص قسم کا
انجام مقدر ہو چکا تھا۔

الین جو اس کا تعاقب کر رہا تھا، یقیناً زرا احمق تھا لیکن ایسا احمق جس کی رگوں
میں مادہ حیات گردش کر رہا تھا۔ ایک انسان جس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ لیکن جو ذی
روح تھا، جس کے جسم میں حیات بجھنے کے ضروری اور اہم اجزاء تھے۔
اور اب وہ وقت قریب تھا۔ بہت قریب تھا۔

پردے کے پیچھے دروازہ اور دروازہ کے پیچھے ایک چکر دار زینہ تھا اور کلیو اس
صندوق کو اسی زینہ پر سے نیچے لئے جا رہا تھا۔

نیچے۔ نیچے۔ اور نیچے۔۔۔ یہاں تک کہ وہ سطح زمین پر پہنچ گیا لیکن وہ نہ
رکا۔ نہ زینہ اترتا رہا۔ اس میں ہما صندوق کو سنبھالے زینہ اترتا ہی رہا اور آخر کار
تم خانے میں پہنچ گیا۔ کلیو سے کہا گیا تھا کہ اسی تمہ خانے میں وہ مجبور ہوگا۔ دشمنوں
نے جب یقین کر لیا تھا کہ اب ظلمت کے دیوتا کا خاتمہ ہو گیا تو اس وقت کونٹ ڈریکولا
نے کلیو کے دل میں کہا تھا کہ اس ظاہری خاتمہ کے بعد اس کی۔۔۔ کونٹ ڈریکولا کی
حیات نو کا آغاز ٹھیک اسی تمہ خانے میں ہوگا۔ اسی تمہ خانے میں شکست فتح میں تبدیل
ہوگی۔ اسی جگہ سے کونٹ ڈریکولا کا ظہور ثانی ہوگا اور اسی جگہ بے نور آنکھوں کو

بیانی بخشی جائے گی اور اسی جگہ پیاس مٹائی جائے گی۔

ہاں اگر ہذا میں پر عمل کیا گیا۔ اگر شرط پورے کئے گئے۔

اس یوق نے جس کا نام الین تھا روانہ تلاش کر لیا تھا جو پتھر کے پیچھے تھا چنانچہ اب وہ بڑی احتیاط سے چکر دار زینہ اتر رہا تھا۔ وہ تہ خانہ میں آگیا۔ اس کے نیچوں نے تہ خانے کے فرش کو چھوا۔ تو کسی کوئی نہیں چکا ڈر پڑ پڑا کر دیکھ گیا اور موم بتی کا جو الین کے ہاتھ میں تھی شعلہ سمٹ کر لمحہ بھر کے لئے موم بتی کی سلاخ میں دبک سا گیا لیکن پھر فوراً ہی ابھر آیا۔ اور اس کی زرد مودہ سی روشنی کے سائے تہ خانے کی سفید دیواروں پر رقص کرنے لگے۔

کلیو ایک طرف دبک گیا۔ رسم کا پہلا مرحلہ اطمینان بخش طور پر ادا ہو چکا تھا۔ تہ خانے کے عین بیچ میں ایک شاندار چوکی پر پتھر کا ایک مرصع تابوت رکھا ہوا تھا اور اندھیرے میں کلیو کے قریب جو مرتبان غامبی کا ظروف تھا جو اس نے اس کالے صندوق سے نکال کر اپنے قریب رکھ لیا تھا۔ اور مرتبان میں وہ چیز تھی جو کلیو کو دنیا کی کسی بھی چیز سے زیادہ عزیز تھی وہ بیش بہا خزانہ جس کی حفاظت وہ دس سال سے کرنا آیا تھا۔ راکھ جو اب بھی ملکیت تھی۔ وہ خاک جو اب بھی گوشت و پوست میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

بشرطیکہ ہذا میں پر پورا پورا عمل ہو۔

الین تہ خانے میں اتر آیا۔ موم بتی کی روشنی اس صندوق پر پڑی جسے کلیو نے ایک کونے میں رکھ دیا تھا۔ صندوق میں سے مرتبان نکالنے کے بعد کلیو نے اس کا ڈھکن کھلائی چھوڑ دیا تھا۔ کچھ تو اس لئے کہ الین قریب آگیا تھا۔ اور ڈھکن بند کرنے کا موقع نہ تھا۔ اور کچھ اس لئے کہ اب اس صندوق میں کچھ نہ تھا۔ اگر الین نے جھانک کر اس صندوق میں دیکھا بھی تو وہ اسے خالی پائے گا۔ چنانچہ اس کو دیکھنے د

اس صندوق میں اور سوچنے دو! الجھنے دو کیونکہ بہت جلد وہ تمام محسوسات سے عاری ہو جائے گا کچھ ہی دیر بعد وہ کچھ نہ محسوس کر سکے گا کچھ نہ سوچ سکے گا۔

صندوق کے پیچھے دیوار پر ایک عمدہ ریشمی لبادہ لٹک رہا تھا یہ لبادہ کالا تھا۔ جس پر سرخ و حاریاں تھیں۔ الین نے اس لبادے کی طرف دیکھا تک نہیں کیوں کہ اس کے نزدیک اس لبادے کی کوئی اہمیت نہ تھی وہ جانتا ہی نہ تھا کہ یہ لبادہ قصر کے مالک کونٹ ڈرنگیولا کا تھا۔

کلیو کے نزدیک الین یوق تھا اور بیٹھ پڑ جانے کے قابل نہ تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ زندہ رہنے کے قابل بھی نہ تھا۔

موم بتی کا شعلہ ذرا سا کانپ کر دھواں اگلنے لگا اور پھر بے حرکت اور سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس کی روشنی اس کتبے پر پڑی جو تابوت کی لوح پر کندہ تھا۔ الین جھک کر اسے دیکھنے لگا۔

خود کلیو نے بڑی محبت سے، بڑے احترام سے، بڑی مشقت سے اور آہستہ آہستہ بڑی احتیاط سے اس کتبے کے X حروف کندہ کئے تھے اپنے آقا کے وعدوں کے باوجود اس نے یہ حروف اس چوکی پر کندہ کر دیئے تھے۔ کیوں کہ کلیو نے اپنا آخری فرض سمجھتا تھا اور اس کے ذریعہ وہ اپنی وقاداری کا اظہار بھی کرنا چاہتا تھا اور اب وہ بڑی شہرت سے محسوس کر رہا تھا کہ اسے دوسرے بھی فرائض ادا کرنے تھے کیوں کہ اس کا وقت آگیا تھا۔

اپنی آنکھیں بند کر کے بھی وہ ان حروف کو صاف طور سے دیکھ سکتا تھا جو تابوت کی چوکی پر کندہ تھے اور جنہیں الین موم بتی کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔ اور یہ حروف ایک خطاب اور ایک نام بتاتے تھے۔ "کونٹ ڈرنگیولا۔" نہ تو مرنے کی کوئی تاریخ لکھی ہوئی تھی نہ دنیا کی بے ثباتی ظاہر کرنے کے لئے

کلیو آہستہ سے اپنی کمین گاہ سے نکل آیا۔ وہ بڑے اطمینان اور سکون سے ایلن کی طرف بڑھا۔ جلدی بچانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس رسم کی ادائیگی میں کسی اصول کی پابندی کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی اسے شان اور تمکنت ہے ادا کرنا تھا لیکن چونکہ وہ اپنے آقا کی ایک زبردست خدمت انجام دے رہا تھا اس لئے وہ بڑی شائستگی اور احترام سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ کسی قسم کی بھی آواز پیدا کئے بغیر طاق کے قریب پہنچ گیا اور ایک ہاتھ بڑھا کر کمبل کے پردے کا ایک کونا پکڑ لیا۔ ایلن چونک کر ایک دم سے اس کی طرف گھوم گیا۔

کلیو کے بشرے سے کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہ ہو رہا تھا۔ جیسے وہ پتھر کے بت کا چہرہ ہو۔ اس نے بڑے اطمینان سے اپنا بڑا سا چاقو نکال لیا اب بھی وہ پرسکون تھا۔ خود اسے احساس تھا کہ اس کی کسی بھی حرکت سے عجلت اور گھبراہٹ ظاہر نہ تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اس کی ایک ایک حرکت بر محل تھی۔ حتیٰ کہ اس کی پھرتی میں بھی ایک عجیب رکھ رکھاؤ تھا ایک عجیب شان تھی چنانچہ جس پھرتی اس نے اپنا چاقو نکالا تھا وہ بھی خود کلیو کو ایک بڑی حسین اور قابل تعریف حرکت معلوم ہوئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خود کو کونٹ ڈرکولا اس کے قریب کھڑا اپنی ٹھہری ہوئی مگر گویا بجا آواز میں اسے ہدایتیں دے رہا ہو تاکہ معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔

کلیو کا چاقو والا ہاتھ چیزی سے بلند ہوا اور دگنی چیزی سے جھکا۔ چاقو کا تیز پھل ایلن کے بدن میں اس طرح آسانی سے اتر گیا جیسے یہ انسان گوندھے ہوئے آلے کا ہٹا ہوا ہو۔ ایلن نے اپنا منہ کھولا۔ شاید چیخنے کے لئے یا شاید کچھ کہنے کے لئے لیکن اس کے حلق سے جو دہنی ہوئی اور گٹھی ہوئی آواز نکلی اس کا کوئی مطلب نہ تھا۔

ایلن لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور اس کی پیٹھ دیوار سے لگ گئی۔ کلیو نے بڑے اطمینان سے لڑکھڑاتی ہوئی اس کے جسم میں سے چاقو کھینچ لیا، اس کا ہاتھ پھر بلند ہو کر جھکا اور

کوئی شعر کندہ کیا گیا تھا اور نہ ہی اس کے حلق کوئی فرسودہ عبارت تحریر تھی کہ کوئی قیامت تک سکون سے سوتا رہے گا کیوں کہ کونٹ ڈرکولا ابھی نہ سویا تھا اور نہ سوئے گا۔ وہ کبھی سکون سے نہ سوئے گا۔ سکون اسے میرا ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ سکون تو بیزلوں کے لئے ہوتا ہے، وہی اس کی آرزو کرتے ہیں اور جب بیوقوفوں کا وقت آتا ہے تو شاید انہیں بھی قیامت تک سکون کی نیند بخشی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ انہیں ملنا ہی کیا ہے؟ ایلن سیدھا کھڑا ہو گیا وہ ایک بار پھر تمہ خانے کا چاہنے لے رہا تھا۔

اور تمہ خانے کے اندر میرے کونے میں کھڑا کلیو اسے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی شکاری نظروں نے تمہ خانے کی دیوار میں وہ جگہ تلاش کر لی جس میں کلیو سویا کرتا تھا۔ ایک طویل طاق سا تھا۔ پورا قعر خالی تھا۔ اس میں بہت سی خواب گاہیں تھیں اور پھر قعر کا کوئی آقا نہ تھا، کوئی مالک نہ تھا چنانچہ کلیو جہاں چاہتا سو سکتا تھا۔ وہ خود اس قعر کا گویا مالک تھا۔ لیکن کلیو نے قعر کی آرام دہ خواب گاہوں سے کبھی فائدہ نہ اٹھایا تھا۔ اس نے اپنے اسی پرانے کھردرے چنگ پر سوتا پسند کیا تھا۔ جو اس تمہ خانے کی دیوار میں پھرتی سل جڑ کر بنایا گیا تھا۔ اپنے آقا سے یہ اس کی محبت ہی تھی جو اسے یہاں تمہ خانے میں اور اپنے آقا کی قبر کے پاس سونے پر مجبور کیا کرتی تھی لیکن یہ بات بھی صرف کلیو ہی جانتا تھا کہ کونٹ ڈرکولا کی قبر خالی تھی۔ اس میں کچھ نہ تھا۔ نہ کوئی لاش اور نہ مٹی۔

ایلن نے وہ کمبل ہٹایا جو پردے کا کلام کر رہا تھا اس کے پیچھے دیوار میں ایک طویل طاق سا بنا ہوا تھا، اس طاق میں پھرتی ایک لمبی سل بڑی ہوئی تھی اور اس پر ایک پتھر پرانا بستر بچھا ہوا تھا۔

وحشت زدہ ایلن پٹی پٹی آنکھوں سے بستر کی طرف دیکھنے لگا۔

کلیو مسکرایا۔ یہ انگریز بے وقوف ضرور تھا لیکن خون سے بھرپور تھا۔ کلیو نے چاقو پھینک کر ایلین کے گرتے ہوئے جسم کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اور اب اسے بڑی تیزی اور پھرتی سے کام کرنا تھا۔ ایلین کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اب وہ زندہ انسان نہ تھا۔ وہ ایک لاش تھا۔ وہ لاش کو تابوت کے قریب گھسیٹ لایا اور اسے تابوت کی چوکی سے نیک لگا کر بٹھا دیا تاکہ اس کا خون بہہ نہ جائے۔ اس طرف سے اطمینان کر کے وہ بھرتہ خانے کی دیوار کے قریب پہنچا اور وہ رسہ کھول لیا جو ایک ستون کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ کلیو اور اس کالے صندوق کی طرح یہ رسہ بھی جیسے اس وقت اور اس گمزی کا انتظار کر رہا تھا۔

انتظار۔۔۔ طویل انتظار۔۔۔ ہر چیز خستہ تھی۔ دس برس سے ہر چیز تیار تھی لیکن کوئی اس جال میں نہ پھنسا تھا۔ لیکن اب چار انچائے فحش اس جال کے کنارے تک آگئے تھے۔ اور ان میں سے ایک فحش آخری قدم اٹھا کر اپنی منزل تک پہنچ چکا تھا۔ اب تین باقی رہ گئے تھے۔

کلیو اب بڑی پھرتی کا جوت دے رہا تھا کیونکہ اب ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اس نے اسے کا ایک سرا ایلین کی لاش کی ٹانگوں کے گرد لپیٹ کر مضبوط گرہ لگا دی۔ اس طرف سے فرصت پا کر وہ پھر ستون کے قریب پہنچا، اپنی ٹانگیں پھیلا کر اور نیچے تہ خانے کے فرش پر جتا کر کھڑا ہو گیا۔ اور اب اس نے دونوں ہاتھوں سے رسے کا دوسرا سرا پکڑا

چاقو ایک بار پھر ایلین کے جسم میں تیر گیا۔ اور اب کلیو نے چاقو گھسیٹ کر اپنے ہاتھ میں سیدھا پکڑ لیا جس طرح قصاب قربانی کے بکرے کو ذبح کرنے کے لئے سیدھا پکڑ لیتا ہے۔ اور پھر اس نے چاقو کی تیز دھار ایلین کے حلق پر پھیر دی۔ اس کے حلق پر اس سرے سے اس سرے تک ایک سرخ لکیری نمودار ہو گئی۔ کلیو نے اطمینان کا سانس لے کر دیکھا کہ ایلین کے حلق پر کی سرخی لکیر آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔



اور اسے کھینچے لگا۔

ایلین کی لاش آہستہ آہستہ نیچے سے اٹھنے لگی۔ اس کی ٹانگیں اوپر تھیں اور سر نیچے۔ کلیو رس کا سرا کھینچتا ہی رہا اور لاش اوپر اٹھتی رہی یہاں تک کہ وہ فرش سے پوری طرح اٹھ گئی۔ اب کلیو اس کا بوجھ محسوس کر رہا تھا اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ لیکن وہ رسہ برابر کھینچنے جا رہا تھا۔ لاش اوپر اٹھ گئی وہ فرش سے کئی فٹ اوپر الٹی لٹک رہی تھی۔ کلیو کوشش کر کے اسے اس کے ٹھیک مقام پر لے آیا۔ لاش اب ٹھیک تابوت کے عین اوپر لٹک رہی تھی ٹانگیں اوپر اور سر نیچے۔ کلیو نے رسے کا دوسرا سرا ستون کے گرد لپیٹ کر وہاں بھی مضبوط کر دیا۔

لاش کے زخموں میں سے جیتا جیتا خون تابوت کے ڈھکن پر ٹپک رہا تھا۔ کلیو تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی استخوانی انگلیاں تابوت کی دیوار اور ڈھکن کی درمیانی دراڑ میں داخل کر دیں۔ اس نے کمر جھکا کر دانت پیس کر اور ہونٹ بھیج کر زور لگایا لیکن ڈھکن کو ایک انچ سے زیادہ اوپر نہ اٹھا سکا۔ اس نے پھر کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا ڈھکن بے حد وزنی تھا اور اسے اٹھانے کے لئے کلیو کو اپنے جسم کی پوری وقت صرف کرنا تھی۔ چنانچہ اب اس نے ڈھکن کے باہر کوٹھے ہوئے کنارے کے نیچے اپنا ایک کندھا لگایا اور اپنے دونوں ہاتھ ٹھٹھوں پر جھا کر جو زور لگایا تو تابوت کا ڈھکن اوپر اٹھ گیا۔ کلیو نے اور زور لگایا۔ ڈھکن اوپر اٹھا اور تابوت کے کنارے پر سے پھسل کر تابوت کے دوسری طرف بڑی آواز کے ساتھ فرش پر جا پڑا۔

تابوت میں کچھ نہ تھا۔ اور خالی تابوت کے عین اوپر رسے سے بندھی ہوئی ایلین کی لاش الٹی لٹک رہی تھی۔ چونکہ وہ ہوا میں بلند تھی اس لئے ہولے ہولے گھوم رہی تھی۔

کلیو دوڑ کر وہ مرتبان اٹھا لایا جو اس نے کالے صندوق میں سے نکالا تھا، بڑے احرام کا اظہار کرتے ہوئے اس نے مرتبان کا ڈھکن کھولا۔ ڈھکن کھل چکا تو اس نے مرتبان کا منہ تابوت کی دیوار کے کنارے سے لٹکا دیا اور آہستہ آہستہ اسے جھکانے لگا۔ بھورے رنگ کی مین راکھ مرتبان میں سے تابوت کے پینڈے میں گرنے لگی۔ کلیو نے مرتبان کو درمیان میں سے دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور اسے تابوت کی دیوار کے کنارے پر آہستہ سے ادھر ادھر کھینچنے لگا۔ راکھ تابوت کے پورے پینڈے میں، ہانسی سے سرہانے تک بکھر گئی۔ راکھ کی سطح ہموار ہونی چاہیے۔ کسی جگہ اس کی ڈبیری نہ ہو اور کوئی جگہ خالی بھی نہ ہو ورنہ وہ نہ ہو گا جو ہونا تھا۔ اور کلیو نے دیکھا کہ یہ شرط پوری ہو گئی تھی۔ راکھ کی سطح بالکل ہموار تھی اور وہ تابوت کے پورے پینڈے میں بکھری ہوئی تھی۔

مرتبان خالی ہو گیا تو ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ یہ مرتبان اب خالی تھا چنانچہ اب اس کا احترام بھی لازم نہ تھا۔ یہ اب ایک حقیر خالی برتن تھا جس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ بیٹ بھانجرا اس تابوت کے پینڈے میں بکھری ہوئی تھی۔ اس نے مرتبان ایک طرف پھینک کر ایک بار پھر اپنا چاقو اٹھالیا۔

دوسرے ہاتھ سے اس نے ایلین کی لاش کے بال پکڑ لئے کہ وہ جھولنے نہ پائے۔ ایک بار پھر اس نے چاقو کی تیز دھار لاش کے حلق کے شکاف پر رکھ دی اور تیزی سے چاقو چلانے لگا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ لاش کے بال پکڑے ہوئے تھا۔ اور سر کو اپنی پوری قوت سے نیچے کھینچ رہا تھا۔

چاقو اپنا کام بڑی تیزی سے کر رہا تھا چنانچہ جلد ہی ایلین کا سر تن سے جدا ہو گیا اور اب وہ کلیو کے دوسرے ہاتھ میں لٹک رہا تھا۔

سرخ خون کی دھاریں تابوت میں گرنے لگیں۔ کلیو نے ایلین کا سر ایک طرف

پھینک دیا۔

تابوت کے کناروں پر فوراً ہی بھورے رنگ کی ہلکی سی دھند نمودار ہو گئی اس دھند کو دیکھتے ہی کلیو کے دل میں خوف اتر آیا لیکن پھر جو کچھ ہونے والا تھا اس کا خیال اس کے خوف پر غالب آگیا اور اب وہ فرط انبساط سے کانپ رہا تھا۔ آخر کار اس کی محنت ٹھکانے لگ رہی تھی۔ انتظار کا طویل دور آخر کار ختم ہو رہا تھا۔

اب تک ان کے دل سے شک دور نہ ہوا تھا۔ حالانکہ اس کے آقا نے کہا تھا کہ اگر ہدایتوں پر عمل کیا گیا تو یہ ہو کر رہے گا۔ تاہم کلیو کو اس پر پوری طرح یقین نہ تھا لیکن اب اسے یقین ہو گیا تھا۔ حیات بخش خون تابوت میں ٹپک رہا تھا اور تابوت میں سے بھورے رنگ کی دھند اٹھ رہی تھی، گاڑھی ہو رہی تھی اور پھیل رہی تھی۔

کلیو گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اس کا آقا نیا جنم لے رہا تھا۔

دھند اور بھی گاڑھی ہو گئی، وہ مختلف مرغلوں میں تقسیم ہو گئی تہہ خانے میں ہوا کے جھوکے ظاہر ہے کہ نہ آسکتے تھے۔ اس کے باوجود دھند کے مرغولے تابوت میں سے نکل کر تہہ خانے میں بکھر گئے۔ جیسے ہوا انہیں گھسیٹ رہی ہو۔

لیکن دھند کا ایک موٹا سا مرغولہ تابوت میں ہی چکر کاٹا رہا اور پھر پھیل کر تابوت کے پینڈے میں بکھری ہوئی مٹی پر پھیل گیا۔ پائنٹی سے سرہانے تک۔

اور وہ ہونے لگا جس کا وعدہ کونٹ ڈریکولائے کیا تھا۔

تابوت کے پینڈے میں بہت سی سرخ اور نیلی رنگیں پیدا ہو گئیں وہاں رگوں، جال سا بچھ گیا اور پھر ان رگوں پر گوشت اور پٹھوں کی تہہ نمودار ہو گئی۔ فوراً تو تابوت کے سرہانے ایک انسانی کھوپڑی کا خاکہ سا ابھرا۔ اس کھوپڑی میں آنکھیں نہ تھیں بلکہ دو گہرے سوراخ تھے اور اس کے ہونٹ بھی نہ تھے لیکن دانتوں کی قفا ضرور تھی اور ان میں وہ دو دانت، جنہیں کتا دانت کہتے ہیں۔ کیلیے اور تیز تھے

بھیرے کے دانتوں کی طرح اور پھر کھوپڑی میں دو آنکھیں پیدا ہو گئیں اور دانتوں کو پہنچنے ہونٹوں نے ڈھک لیا۔ ایک ہاتھ بنا۔۔۔۔۔ ابتدا میں یہ ہاتھ خشک ٹہنی کی طرح پتلا اور کانچ کی طرح تھا۔

اور پھر وہ ہاتھ ٹھوس بن گیا۔ ہاتھ اوپر اٹھا، اس کی پتلی اور لائمی انگلیوں نے تابوت کا کنارہ پکڑ لیا اور وہ آہستہ آہستہ اٹھنے لگا جو تابوت میں بن چکا تھا۔

کونٹ ڈریکولا دوسرا جنم لے چکا تھا۔ دس سال بعد ایک بار پھر وہ اپنے تابوت میں سے نکل رہا تھا۔ اس کی بے بسی اور بے چارگی کا دور ختم ہو چکا تھا۔

یکبارگی بجلی بڑے زور سے چمکی، گرمی اور دل دہلا دینے والی آواز افق تا افق لڑھکتی چلی گئی، کہیں دور جنگل کے قلب میں بھیرے ایک آواز ہو کر چلانے لگے لیکن عناصر کے تصادم اور بھیروں کی چیخ و پکار کا مطلب کسی کی بھی سمجھ میں نہ آیا۔

قصر ڈریکولا کے مسمان بے خبر پڑے سوتے رہے۔ انہیں پتا بھی نہ چلا کہ کیا ہو گیا تھا اور دنیا والے بھی اس بات سے بے خبر رہے کہ کونٹ ڈریکولا وہ عفریت جو راتوں کو اپنی قبر سے نکل کر لڑکیوں کا خون پی لیا کرتا تھا۔۔۔۔۔ پھر بیدار ہو چکا تھا۔

اور وہاں، قصر ڈریکولا کے تہہ خانوں میں گھٹنوں کے بل جھکا ہوا کلیو خوف و ہیبت کے جذبات سے بے قابو ہو کر ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ وہ جو تابوت میں بن چکا تھا تابوت میں سے نکل آیا تھا۔ لیکن کلیو سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔ اور اب جب اس جانی پہچانی گونجندہ آواز نے اسے ایک حکم دیا تو اس وقت بھی کلیو نے سر نہ اٹھایا تاہم اس نے یہ ضرور محسوس کر لیا کہ اس کا آقا اس وقت کمزور ہو رہا تھا۔ بے حد کمزور۔۔۔۔۔ یہ کمزوری اس کی آواز سے بھی عیاں تھی۔ اور اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی کیونکہ اس کا آقا ایک نہ دو، پورے دس سال سے پراسا تھا اور دس سال بعد آج بیدار ہو رہا تھا۔

بہاؤں کی طرف دھیان نہ دیا اور گزر گاہ کے انتہائی سرے پر پہنچ گیا اور پردہ اٹھا کر
دوسری طرف زینہ اترنے لگا۔ ہیلن اس کے پیچھے ہی زینہ اتر رہی تھی۔ وہ دونوں
آگے پیچھے زینہ اترتے رہے۔ اور زینے کے قدموں میں پہنچ کر وہ رک گیا اور ہیلن کا
نظارہ کرنے لگا۔

اور وہ اس باختم ہیلن زینہ اتر کر اس کے قریب پہنچ گئی تو وہ اسے راستہ دینے کے
لئے ایک طرف ہٹ گیا اور اپنے خون آلود ہاتھ سے تہہ خانے کی طرف اشارہ کر کے
رہا۔

”میں جا کر دو سروں کو بیدار کرتا ہوں۔“

ہیلن نے قدم آگے بڑھایا۔ اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ بس جیسے توئم کے عالم
نہ وہ آگے بڑھ گئی۔ کلیو زینے کے قدموں میں خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

اور وہاں تہہ خانے میں ہیلن کے شوہر کی لاش جس کا سر غائب تھا الٹی لٹک رہی
تھی۔ اس کے جسم کے اس حصے سے جو کبھی ردن تھی۔ خون اب بھی قطرہ قطرہ ٹپک
با تھا۔ ہیلن نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملیں اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ جو
کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ حقیقت تھی اس نے وہ ایک خواب پریشاں ہی سمجھے ہوئے تھی اور
اس کا خیال تھا کہ یہ بھی ایک خواب کچھ ہی دیر بعد غائب ہو جائے گا۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ چنانچہ وہ آگے بڑھی اور قصداً سرخ سرخ کر آگے بڑھی کہ اگر وہ
موتی ہو تو اس کی آنکھ کھل جائے اور یہ بھی ایک خواب غائب ہو جائے گا۔

”اور پھر اسے احساس ہوا کہ کلیو اس کی حیرت اور اس کے خوف سے محفوظ
رہا تھا۔ اور ہیلن کو یقین ہو گیا کہ یہ خواب نہ تھا۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ اس
کے قدم لڑکھڑا گئے۔ بے شک اس کھلے ہوئے تابوت پر اوندھی لٹکتی ہوئی بے سر کی
لاش اس کے شوہر کی ہی تھی۔“

اس کو نجلد اور کمزور آواز نے کلیو کو وہ حکم دیا تو موخر الذکر نے صرف اثبات میں
سر ہلادیا۔ کئی برسوں کے بعد جو کلیو کو کئی صدیاں معلوم ہوئی تھیں اسے ایک بار پھر
حکم مل رہا تھا چنانچہ اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔

وہ سر ہلا کر اٹھا لیکن اس نے نظریں نہ اٹھائیں۔ وہ ہر قدم پر احتیاط کر رہی
تھی جھلکا تہہ خانے کے زینے تک اٹنے کے قدموں چلتا ہوا پہنچ گیا اور پھر پلٹ کر بدستور
سر جھکائے زینہ چڑھنے لگا۔ وہ اوپر پہنچ گیا اور گزر گاہ میں پہنچ کر وہ اس خواب گاہ کی
طرف چلا جس کا دروازہ کھول کر ایلن ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی باہر آیا تھا۔

اس نے خواب گاہ کے بند دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اس کے دونوں
ہاتھ اب بھی خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ ایلن کے خون میں۔۔۔ لیکن دستک دینے
کے فوراً بعد ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ پشت کے پیچھے چھپالئے۔

آہستہ سے دروازہ کھلا اور ہیلن اپنے عین سامنے اور اپنے اتنے قریب کلیو کو کھڑا
دیکھ کر کانپ گئی۔ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔

”مادام!“ کلیو نے کہا۔ ”بد قسمی سے ایک حادثہ ہو گیا ہے۔“

ہیلن خاموش رہی۔ وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”آپ کے شوہر۔۔۔۔۔۔“ کلیو نے پھر کہا۔

لیکن ہیلن پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی صورت دیکھتی رہی۔

”آپ کے شوہر کے ساتھ ایک منحوس حادثہ ہو گیا ہے مادام۔ آپ فوراً تشریف

لائیے“ کلیو نے کہا۔

اور وہ پلٹ کر جس طرف سے آیا تھا اسی طرف چل دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہیلن اس
کے پیچھے پیچھے آرہی ہے۔

کلیو نے اپنی رفتار کم نہ کی حالانکہ ہیلن اسے پکارتی رہی۔ اس نے ہیلن کی

نے اپنا سر جھکایا اور اس کے دو نکیلے دانت ہیلن کی شہ رگ میں پیوست ہو گئے۔ خون کی ایک بہتی لکیر ہیلن کی گردن سے اس کے سینے تک رینگ گئی۔ کونٹ ڈر کیولا بڑی رغبت سے ہیلن کا خون چوس رہا تھا۔ دس سال بعد آج اس کی پیاس بجھ رہی تھی۔



اور ہیلن کی ایک دل خراش چیخ اس تہہ خانے میں گونج گئی۔ اور ایسی چیخ پورے دس سال بعد آج پہلی دفعہ اس قصر میں گونجی تھی۔ تھری سنگین دیواروں، خاموش اور اندھیری گزر گاہوں کے لئے اور خود کلیو کے لئے ایک دل نواز نغمہ تھی۔

ہیلن پھر چیختی۔۔۔ وہ چلتی۔۔۔ وہ اس تہہ خانے سے نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ بھاگ جانا چاہتی تھی۔ وہ کسی بھی طرف بھاگ جانا چاہتی تھی۔

لیکن کہیں سے ایک دھلا پتلا سایہ نکل آیا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ کلیو خوف سے سمٹ گیا اور بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس دبلے پتلے فخر کے کندھوں سے وہ لبادہ لٹک رہا تھا جو اس وقت جب ایلن تہہ خانے میں آیا تھا دیوار کی ایک کھونٹی سے منگا ہوا تھا۔ وہی سرخ دھاریوں والا کالا لبادہ۔ قصر کا آقا ہیلن کا راستہ روک کر کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ لمبو ترا اور مروے کی طرح زرد تھا رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اور حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھوں میں عجیب چمک اور اس چمک میں عجیب قوت تھی جو کسی کو بھی جکڑ سکتی تھی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہیلن کی طرف بڑھا دیئے۔ ہاتھوں کی پہلی اور لائی انگلیاں شکاری پرندے کے پنجوں کی طرح تھیں۔ ہیلن لڑکھڑا کر ایک طرف جھک گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے ہوش ہو چلی تھی یا شاید ہو چکی تھی۔ کالے لبادے والے پتلے ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔

اور اس کے پیلے ہونٹ اس کے دانتوں پر کھنچ گئے، دو لالہ اور نوکدار دانت چمکنے لگے۔۔۔ کونٹ ڈر کیولا مسکرا رہا تھا۔ اس نے ہیلن کے بے جان سے سر کو ایک طرف کر کے کندھے پر دھلکا دیا۔

بے ہوش عورت کی گردن میں ایک رگ، پھڑک رہی تھی، شہ رگ کونٹ ڈر کیولا

چلے تھے۔

”میرے خدا! گیارہ بج گئے!“ وہ بڑبڑایا ”لیکن ایلن اور ہیلن نے ہمیں جگایا کیوں نہیں۔ یا وہ بھی اب تک پڑے سو رہے ہیں؟“

”وہ دونوں یہاں نہیں ہیں؟“

”کیا۔ آ۔ آ۔؟“

”وہ یہاں نہیں ہیں۔“

”تو کہاں گئے ہیں؟“

”چلے گئے۔“

چارلس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی لیکن سمجھ نہ سکا۔

”چلے گئے! کیا مطلب؟“

ڈائنا کی آنکھیں نم تھیں۔

”بالکل ہی چلے گئے“ اس نے روئی سی آواز میں جواب دیا۔

”یہ کیا ایک ہی بات رٹے جارہی ہو۔؟ صاف صاف کہو۔“

”وہ لوگ یہاں نہیں ہیں اور ان کا سامان بھی غائب ہے۔“

ڈائنا نے یہ بڑی عجیب بات کہی تھی چنانچہ اس کی پلوں میں پھنسے ہوئے نیند کے کڑے خود بخود جھڑ گئے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے!“

اس نے ایک ذوقی سی جھانک کر خلاف ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ڈائنا پیاری تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟“ اس نے کہا اور اپنی ٹانگیں پلنگ سے بچھے لگا دیں۔

ڈائنا نے جواب دیئے بغیر نفی سر ہلا دیا۔

ایک ہاتھ اس کندھے کے گوشت میں اترا جا رہا تھا اور اسے بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا اور وہ ایک خواب میں اپنے آپ کو اس کو جوان کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو اسے کبھی پر سے گھسیٹ کر نیچے نیچے دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

”چارلس!۔۔۔ اٹھو۔“

اور اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن دوسرے ہی لمحے پھر بند کر لیں۔ وہ دوبارہ سو جانا چاہتا تھا۔ کافی دن چڑھ آیا تھا اور روشنی بند پوٹوں میں سے اس کی آنکھوں میں پہنچ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ وہ لوگ شاید دیر تک سوتے رہے تھے۔ گزشتہ کل کی پریشانی کے بعد یہ گہری پرسکون اور طویل نیند ایک نعمت تھی۔

ڈائنا اس کے بستر کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ڈیر تک گاؤن میں بے حد پرکشش اور حسین معلوم ہو رہی تھی۔ رات بھر کی نیند نے اسے تازہ دم کر دیا تھا۔ اور اس کے رخساروں کے گلاب کھل اٹھے تھے۔ چارلس کو اپنی بیوی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ بڑی فرمانبردار اور وفا شعار تھی لیکن کبھی کبھی وہ بڑی مستعدی کا ثبوت دیتی تھی اور اس وقت چارلس کا خود ڈائنا سے اس کی شکایت کرنے کو جی چاہتا تھا۔ مثلاً یہ کہ اب اس وقت خواہ خواہ اسے بیدار کر دینے کی کیا ضرورت تھی وہ اپنی مرضی سے اٹھتا اور دو چار تمیدی جمائیاں لینے کے بعد بستر میں سے نکلتا۔ بہر حال وہ بڑی بے دلی سے ایک کمنی کے بل نیم دراز ہو گیا۔

”کیا بات ہے“ اس نے کہا۔

اور پھر کراٹ لے کر اس ٹائم پیس کی طرف دیکھا جو میز پر رکھی ہوئی تھی گیارہ بج

وہ کمرہ عبور کر کے آتشخان کے قریب پہنچا۔ آتشخان خالی اور صاف تھا اس کے پیچھے میں راکھ کا ایک ڈرہ تک نہ تھا حالانکہ گذشتہ رات اس آتشخان میں آگ جل رہی تھی۔

”کہاں ہے وہ الو کا پٹھان؟“ چارلس نے ایک دم سے پوچھا۔

”کون؟“ ڈانٹا سہم گئی۔

”وی۔ کیا نام تھا اس کا؟“۔۔۔۔۔ ہاں۔ کلیو۔“

”وہ بھی نہیں ہے۔“

”نہیں ہے!“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں نے اسے بلانے کے لئے تھنٹی بجائی تھی۔ لیکن جب وہ نہ آیا تو۔۔۔۔۔“

”تو کیا کیا تم نے؟“

”میں اسے دیکھنے کے لئے نیچے گئی۔ وہ کہیں نہ تھا۔ کلیو بھی غائب ہے

بڑی عجیب اور مضحکہ خیز بات تھی یہ تو۔ اس معنی کا ایک نہ ایک منطقی جواب

ہو گا ضرور۔ یہ تو تسلیم ہی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ الین، ہیلن اور کلیو راتوں رات غائب

ہو گئے تھے۔ چارلس کمرے میں سے نکل آیا۔ گزرگاہ عبور کر کے برآمدے میں اور

زنہ کے ماتھے پر آگیا۔

”کلیو۔“ اس نے آواز دی۔

نیچے کا بڑا کمرہ خالی تھا۔ گزشتہ رات جس میز کے گرد بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا

تھا۔ وہ میز وہیں موجود تھی۔ لیکن تنگی تھی۔

”کلیو۔“ وہ پھر چیخا۔

لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ ہاں البتہ اس کی آواز قصر کی سنگین دیواروں سے ٹکرا کر

اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا ڈرننگ گاؤن اٹھایا اور اسے پہنتا ہوا کمرے میں سے نکل کر گزرگاہ میں آگیا۔ ڈانٹا اس کے پیچھے تھی۔ دونوں اس کمرے میں پہنچے جو الین اور ہیلن کو دیا گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے کمرے میں ایک نظر ڈالی تو چونکا۔ یہ شاید الین اور ہیلن کا کمرہ نہ تھا۔ یہ تو کوئی انجانا سا کمرہ تھا۔ گذشتہ رات چونکہ وہ ممکن اور نیند سے چور ہو رہا تھا اس لئے اسے اپنے بھائی اور بھابی کا کمرہ یاد نہ آ رہا تھا اور اس وقت وہ شاید غلطی سے دوسرے کمرے میں آگیا تھا۔

کمرہ صاف ستھرا تھا اور پٹنگ پر صرف ایک چادر بچھی ہوئی تھی اور اس کمرے میں کچھ نہ تھا۔ نہ تو سامان تھا نہ کچھ اور بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کمرہ ایک عرصے سے استعمال نہ کیا ہو۔

وہ پلٹ پڑا۔

ڈانٹا نے کہا ”یہ انہی کا کمرہ ہے“

”ایں!“ اس نے احمقوں کی طرح منہ پھاڑ دیا۔

”یہ وہی کمرہ ہے چارلس۔ میں جانتی ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ یقین کرو تم کسی دوسرے کمرے میں نہیں آگئے ہو بلکہ یہ وہی کمرہ ہے اور یہ میں یقین سے کہہ رہی ہوں۔“

چارلس کو بھی اس کا یقین تھا لیکن وہ یقین کرنا نہ چاہتا تھا کیونکہ چند حقائق اس کے حافظے سے دست و گریباں تھے۔ اگر واقعی یہ ان کا کمرہ تھا تو الین اور ہیلن کہاں تھے؟ ان کا سامان کہاں تھا؟ نہ تو ان دونوں کا کہیں پتہ تھا۔ اور نہ ان کے سامان کا چنانچہ یہ یقین کر لینا آسان نہ تھا۔ اس کے برخلاف یہ سمجھ لینا آسان تھا کہ وہ غلطی سے کسی دوسرے کمرے میں آگئے تھے اور یہ بات قرین قیاس بھی تھی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ الین اور ہیلن ہوا بن کر اڑ گئے ہوں۔

لوٹ آئی، بالکل اسی طرح جس طرح گذشتہ رات وہ دروازہ کھول کر قصر کے مالک
پکار رہا تھا۔ تو اس کی آواز خود ہی بازگشت پیدا کر کے خاموش ہو جاتی تھی۔
چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے ڈانٹا سے کچھ کہنے کے لئے پیچھے مڑ کر
دیکھا۔ لیکن ڈانٹا وہاں نہ تھی۔ وہ بھی غائب تھی۔ یہ کیا راز تھا؟ کیا اس پر اسرارِ تم
میں انسان ہوا میں تحلیل ہو جاتے تھے؟



”چارلس بے حد پریشانی کے عالم میں اسی جگہ سے پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف
بھاگا۔ ڈانٹا کمرے میں ہی تھی، نہ صرف کمرے میں تھی بلکہ سوٹ کیسوں میں کپڑے
ٹھونس رہی تھی۔ ڈانٹا کی ذات میں بڑا رکھ رکھاؤ تھا۔ اور وہ ہر چیز قرینے سے اور
لباس تمہ کر کے احتیاط سے رکھنے کی عادی تھی، لیکن اس وقت وہ باقاعدہ کپڑے اور
لباس سوٹ کیسوں میں اندھا دھند ٹھونس رہی تھی چنانچہ معلوم ہوا کہ انتہائی خوف
سے اس کے حواس باختہ ہو رہے تھے۔

”یہ کیا کر رہی ہو تم؟“ چارلس نے پوچھا۔

”میں اس قصر سے فوراً چلی جانا چاہتی ہوں۔“

”اس‘..... یعنی۔۔۔“

”سنا نہیں..... میں یہاں سے فوراً چلی جانا چاہتی ہوں۔“

”یعنی..... میرا مطلب ہے۔۔۔ جیلن اور ایلن کے بغیر ہی۔۔۔؟“

”کیا وہ دونوں ہمیں چھوڑ کر نہیں چلے گئے؟“

”ہیں..... میں..... نہیں جانتا..... یہ نہ تم کہہ سکتی ہو، اور نہ میں کہہ.....۔۔۔“

”وہ کسی طرف بھی گئے ہوں۔“ ڈانٹا نے ہچکلی لے کر کہا ”بہر حال وہ چلے گئے اور

نہ تو ہم سے کہہ کر گئے اور نہ کوئی پیغام ہی چھوڑ گئے۔ اور میں بھی یہاں سے چلی جانا

چاہتی ہوں۔۔۔۔۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“

اترے گئے۔

ان کے پیروں کی چاپ خالی دیر ان کمرے میں پڑی بھیاں انداز میں گونج گئی۔ یہ کمرہ انہیں گزشتہ رات بے حد آرام دہ اور خوشگوار معلوم ہوا تھا۔ لیکن آج یہی کمرہ اجاڑ اور بھیاں تھا۔ کمرہ اس کی ہر چیز بلکہ پورا قصر جیسے تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کی ایک ایک چیز سے کھڑکیوں اور دروازے سے اور اس کی دیواروں اور پردوں سے ایک عجیب طرح کی ہیبت ٹپک رہی تھی ایک ایسی ہیبت جس کا تعلق اس دنیا سے قطعی نہ تھا اور اب چارلس نے بھی دل ہی دل میں ’اعتراف کیا کہ اگر وہ اس قصر سے نکل آئے، صبح سلامت نکل آئے تو یہ واقعی ان کی خوش قسمتی ہوگی۔

باہر فضا سرد تھی اور ہوا کے جھوکوں میں استرے کی سی کٹ تھی وہ دونوں پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر صحن عبور کر کے پل پر آگئے۔ خندق کے پانی پر برف جمی ہوئی تھی۔ وہ اسے عبور کر رہے تھے۔ کہ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور ان کے کھلے ہاتھوں اور رخساروں پر سرد تھپڑ مار کر گزر گیا۔ برف باری شروع ہو چکی تھی۔ برف روکی کے گالوں کی طرح گر رہی تھی اور ہوا کے جھوکے ان گالوں کو اڑاتے پھر رہے تھے کہیں کوئی ٹھنڈا ہوا لومڑا اپنی کمرہ آواز میں چیخ رہا تھا، لومڑی اس ایک آواز کے علاوہ ہر طرف موت کی سی خاموشی تھی۔

کوئی سو گز تک چلتے رہنے کے بعد وہ قصر ڈریکولا کی سرحد سے نکل آئے اور قہر ڈانٹا نے سوٹ کپس زمین پر رکھ دیئے اور کئی دفعہ اپنے ہاتھوں کو ہلایا۔ اور آپس میں رگڑ کر انہیں گرم کیا کیونکہ وہ ٹھنڈے تھے۔ ڈھلان اترتے وقت انہیں راستہ میں ہسٹائے کے لئے کئی دفعہ رکنا پڑا، گزشتہ رات جب وہ یہ ڈھلان چڑھے تھے تو ان کی رفتار تیز تھی کیونکہ وہ اس بکھی میں سوار تھے جسے وہ پراسرار اور سیاہ گھوڑے سمجھ رہے تھے لیکن اس وقت ان کی رفتار بے حد سست تھی، کیونکہ وہ پیدل تھے اور پھر

”بھی اور اسی وقت۔۔۔“ اس نے چیخ کر کہا۔

چارلس نے پہلے کبھی اپنی بیوی کو اس عالم میں نہ دیکھا تھا۔ وہ غصے بھی تھی، خوفزدہ بھی اور رو بھی رہی تھی چنانچہ اس وقت اسے کچھ سمجھنا مناسب نہ تھا۔ جب تک کہ وہ اس قصر سے باہر نہیں نکل جاتے بحث فضول تھی۔ ڈانٹا اس وقت اپنے آپ میں نہ تھی۔

چنانچہ وہ اپنی بیوی کا ہاتھ پٹانے لگا ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی باتوں سے اس کا غصہ اور خوف دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب چونکہ چارلس نے اس کی بات مان لی تھی اس لئے ڈانٹا بھی اسے خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی لیکن وہ اپنے جذبات پر قابو حاصل نہ کر سکی اس کے ہاتھ بدستور کانپتے رہے اور چند ثانیوں بعد ہی وہ ایک بار پھر سوٹ کیسوں میں کپڑا ٹھونس رہی تھی۔

سوٹ کیس وغیرہ خامے وزنی تھی۔ چنانچہ چارلس نے چاہا کہ تھوڑا سا سامان بیس چھوڑ دیا جائے اور بعد میں کسی کو بھیج کر منگوا لیا جائے یا پھر کل سامان فی الحال یہی پڑا رہنے دیا جائے اور وہ دونوں خالی ہاتھ قصر سے نکل پڑیں۔ چوراہے پر اگر کوئی راہ گیر مل گیا تو اسے منہ مانگی رقم دے کر سامان لانے کے لئے بھیج دیں گے۔ لیکن جب اس نے ڈانٹا کی صورت دیکھی۔ تو اس نے یہ مشورہ اپنے پاس ہی رکھا اس کے بشرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ چارلس کا یہ مشورہ کسی صورت تسلیم نہ کرے گی اس منحوس قصر میں ان کی کوئی چیز حتیٰ کہ ایک تنکا تک باقی نہ رہنا چاہیے۔ اپنا کل سامان لے کر اس بھیاں اور پراسرار قصر سے نکلنا اور بھولے سے بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا تھا۔

ان دونوں نے دو سوٹ کیس اٹھائے اور گزر گاہ کو عبور کر کے آہستہ آہستہ

تھیں۔ یہاں سے نظر آتے تھے، یہ قصر اور اس کے برج کسی بھی جھکے ہوئے مسافر کو لپکا کر اپنی طرف کھینچ سکتے تھے۔ اس دیرانے میں یہ قصر بڑی ہی پرکشش تھا۔ اور مسافر اس کی طرف دیکھنے کے فوراً بعد ہی اس پر پہنچ راستے پر چل پڑتا جو اوپر جاتا تھا۔ قصر ڈریگولا کی طرف جو اسرار کا گڑھ تھا۔ نہیں وہ اس طرح یہاں سے نہیں جاسکتا اگر اس کے بھائی اور ہیلن کے ساتھ اس قصر میں کوئی واقعہ ہوا تھا۔ تو پھر اس کا یہ فرض ہو جاتا تھا کہ وہ اس کے متعلق تحقیق کرے اور وہ تحقیق کرے گا۔

ڈانکا نے اس کی دلی کیفیت معلوم کر لی۔ چنانچہ بولی۔

”چارلس! نہیں..... خدا کے لئے نہیں..... تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ.....“

”ڈانکا! میرا ایک بار پھر وہاں جانا بہت ضروری ہے۔“

”میری خاطر چارلس.....“

”لیکن میرے بھائی ایلن کا کیا ہوا؟ میری بھائی ہیلن کا کیا ہوا؟ کیا جواب دوں گا؟ میں لوگوں کو؟ اور اگر میں اس وقت انہیں چھوڑ کر چلا گیا اور بعد میں کبھی ان کے متعلق کوئی خبر نہ ملی تو میرا ضمیر مجھے ملامت نہ کرے گا۔؟“

”کیا میری زندگی اجڑن نہ ہو جائے گی۔؟“

”کم سے کم میری ایک بات تو مان لو۔“

”کون سی بات؟“

”ہم جوزف باو چلتے ہیں۔“

”چھانچھو؟“

”پھر ہم مدد لے کر آجائیں گے۔“

”کیسی مدد اور کسی کی مدد ڈانکا؟“

سامان بھی آٹھائے تھے۔

چارلس کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ دونوں اس قصر کے پر اسراریت معلوم کیے بغیر اس میں سے نکل آئے تھے جیسے جیسے وہ قصر سے دور ہوتا جا رہا تھا اس کی بے چینی اور شوق تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ ڈانکا کے دماغ پر فرار..... صرف فرار سوار تھا، لیکن جب وہ یہاں سے دُور پہنچ جائیں گے اور خدا کا شکر ادا کر رہے ہوں گے۔ کہ وہ یہاں سے صحیح سلامت نکل آئے تو پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟۔ اپنے وطن میں پہنچ کر وہ ہیلن اور ایلن کی گمشدگی کے متعلق اپنے دوستوں سے کیا کہیں گے؟ کیوں کہ یہ تو انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ ان دونوں کے ساتھ کیا واقعہ ہوا تھا؟ وہ آسمان پر چلے گئے یا زمین میں دھنس گئے؟ کوئی پیغام اور اپنا کوئی نشان تک چھوڑے بغیر وہ دونوں آخر کہاں جاسکتے تھے؟

”شاید رات کے وقت وہ دونوں کسی وجہ سے خوفزدہ ہو گئے اور راتوں رات قصر سے نکل کر کسی طرف چل دیئے۔“ چارلس نے خود اپنی ڈھارس بدھانے کی کوشش کی۔

لیکن اگر ایسا ہی تھا تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ ایسی بھی کیا بات تھی کہ وہ دونوں میاں پڑتی کچھ کے بغیر فرار ہو گئے تھے؟ نہیں یہ ممکن ہی نہ تھا۔ کہ وہ دونوں ڈانکا اور چارلس کو اپنے ساتھ لئے بغیر چلے جاتے۔

ڈانکا اور چارلس ڈھلان سے اتر کر چوراہے پر پہنچ گئے انہوں نے اپنا اپنا سامان لکڑہارے کی جھونپڑی کے قریب رکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔

چاروں سمتوں میں جاتے ہوئے چاروں راستہ خالی اور ویران تھے۔

چارلس نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا جس طرف سے وہ آئے تھے۔ قصر ڈریگولا کی فصیل اور برج، جن کی چوٹیاں برف کے گالوں کی وجہ سے سفید ہو رہی

”کچھ ہی کیوں ہو جائے؟“ ڈانٹا نے بڑے میکانیکی انداز میں دہرایا۔

چارلس نے اسے اپنی بانسوں میں سمیٹ لیا اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولا ”ڈانٹا میں بلاوجہ کوئی خطرہ مول نہ لوں گا اس کا میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”سچ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں سچ کہہ رہا ہوں۔“ چارلس نے اسے یقین دلایا ”لیکن بہر حال معلوم کرنا ہے کہ الین اور جیلن کے ساتھ کیا واقعہ ہوا۔ یہ تو بڑی بڑی ہے کہ ہم خاموشی سے اپنی شکست قبول کر لیں۔“

”شکست! کون شکست دے رہا ہے ہمیں؟“

”وہ..... وہ..... ایک خالی مکان۔“

”چارلس!“

”کیا ہے؟“

”پانچ بجے اندھیرا اتر آتا ہے۔“

”لیکن تم اندھیرے سے نہیں ڈرتے؟“

”اس جگہ یہاں ڈرتی ہوں۔“

”بہت اچھا۔ میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔“

اور اس نے ڈانٹا کے ہونٹ چوم لئے ”ڈانٹا نے اس پوسے کا جواب بڑے خلوص سے دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے آپ کو ڈانٹا سے الگ کر چکا تھا اور اس سے پہلے کہ موخر الذکر کچھ کہتی یا کوئی التجا کرتی وہ اس راستے پر چل پڑا۔ جو قصر ڈریکولا تک جاتا تھا۔

دن کی روشنی میں قصر ڈریکولا ایک بے حد معصوم قدیم عمارت معلوم ہوتا تھا۔ اور اس عمارت کے مختلف حصوں کی تعمیر مختلف ڈھنگ سے کی گئی تھی۔ چارلس نے

”وہاں کے باشندوں کی۔“

”کوئی ہماری مدد نہ کرے گا۔“

”آخر کیوں؟“

”اس لئے کہ مقامی لوگ اس قصر کے وجود کا اقرار ہی نہیں کرتے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ قصر موجود ہے۔ کچوان نے بھی انکار کر دیا تھا اس نے قصر کی طرف دیکھا تک نہیں۔ یہاں کے لوگ اس کے متعلق کچھ بھی کہنے کو تیار نہیں ہیں پھر وہ ہماری مدد کیا کریں گے؟“

”ڈانٹا نے گردن گھما کر قصر کی طرف جاتے ہوئے راستہ پر نظری جیسے اسے خوف ہو کہ کوئی دم میں وہی پراسرار کچوان کی بکھی آتی نظر آئے گی۔

”بہت اچھا۔“ اس نے کہا۔ اگر ہمیں واپس جانا ہی ہے تو.....“

”تم نہیں ڈانٹا۔“ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ چارلس نے کہا۔

”اور میں؟“

تم یہیں رہو۔ اگر کوئی تبھی یا کوچ گاڑی اس طرف سے گزرے تو اسے روکنے کی کوشش کرنا۔ بشرطیکہ وہ بے کچوان کی نہ ہو۔ اب اگر تم کچوان کو قصر تک آنے کے لئے تیار کر سکو تو کہنا۔“

”اور اگر وہ نہ آئے تو؟“

”تو پھر تم خود جوزف باڈچل جانا، کم سے کم ہمارا سامان ہی بھیج دینا اور تم اسی جگہ میرا انتظار کرنا۔“

”انتظار کروں؟“ ڈانٹا نے خوف سے کانپ کر کہا۔

”اس وقت دھائی بج رہے ہیں۔“ چارلس نے کہا۔ ”میں ساڑھے چھ بجے تک واپس آجاؤں گا، خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔“

ناجس طریقے سے وہ نمودار ہوا تھا اور الین اور ہیلن۔۔۔۔۔
اور خیالات کا دھاگہ یہاں کٹ سے ٹوٹ گیا۔

یہ بات قرین قیاس نہ تھی کہ ان کے ساتھ کوئی واقعہ ہو گیا ہو۔ الین دولت مند فرد تھا۔ لیکن اتنا بھی نہ تھا کہ اس کے ساز و سامان میں کوئی قیمتی چیز ہو، چنانچہ اب کسی نے الین اور ہیلن کو اس فرض سے کہیں قید کر دیا تھا کہ وہ بعد میں چارلس سے درشتگاری طلب کرنے تو یہ اس کی حماقت تھی۔ کیونکہ انگلستان سے اتنی بڑی رقم منگوانے کے لئے کافی وقت درکار تھا۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ کوئی بھی ڈاکو اتنا گدھا تو نہیں ہو سکتا چنانچہ کسی ڈاکو یا راجزن نے ان دونوں کو روپے کے لالچ میں گم نہ کیا تھا اور اس کے متعلق سوچنا فضول تھا۔

چارلس زینہ چڑھ کر گزر گاہ اور وہاں سے خوابگاہ میں پہنچا۔ اس نے اس کمرے کا ایک ایک کونہ دیکھ ڈالا اور ایک ایک چیز کو بار بار اور بڑی باریک بینی سے دیکھا۔ لیکن اسے کوئی ایسی چیز نہ ملی جو ہیلن اور الین کی گمشدگی کے معنی کو حل کر سکتی یا اس پر کم سے کم کچھ روشنی ہی ڈال سکتی

گزر گاہ کی کھڑکیوں میں سے اس نے قصر کے اندرونی صحن میں نظری قصر کا سایہ صحن میں اس سرے سے اس سرے تک بچھا ہوا تھا صحن اجاز اور سرد تھا اور اس تک پہنچنا ناممکن تھا۔ تاہم وہ قصر کی طرح خوفناک اور ڈراؤنا معلوم نہ ہوتا تھا صحن کے انتہائی سرے پر دیوار تھی اور دیوار کے عقب میں بلند دیوالا اور سائے دار درختوں کی قطار اور یہ درخت یوں کھڑے تھے جیسے کسی محاذ پر سپاہی صف بنائے کھڑے ہوں۔
چارلس آگے بڑھا۔

وہ دروازے کھول کر خالی خوابگاہوں اور فرنیچر سے محروم نیگے کمروں میں جھانکتا رہا۔ قصر ڈر کیولا نہ تو کسی کا گھر تھا اور نہ ہی قابل دید مقام جسے دیکھنے کے لئے سیاح

اس قصر کو زیادہ اور کوئی خاص اہمیت دینے کی کوشش نہ کی وہ اس قصر کو بس ایک قدیم عمارت ہی یقین کرنا چاہتا تھا جس کی تعمیر مختلف زمانوں میں مختلف معماروں نے کی تھی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر اس نے اس قصر کو پراسرار نہ سمجھا اور اپنے دل میں خوف دہرا اس کو جگہ نہ دی تو اس کا کام آسان ہوگا۔ وہ بڑے اطمینان سے اس کے اسرار معلوم کر سکے گا بشرطیکہ اس میں اسرار ہوں۔

اور جب وہ خندق کا پل عبور کر رہا تھا تو اب پہلی دفعہ اس نے دیکھا کہ یہ پل مرمت طلب تھا اور خندق کا پانی جم کر بن ہو گیا تھا اور اس کی سطح پر بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ یہ پتھر قصر کی فصیل اور بیروں پر سے ٹوٹ کر گرے تھے، گزرے ہوئے زمانے کے اثرات اس پر اب بوجھ بن چلے تھے۔ جگہ جگہ سے قصر کی دیواروں کا پلاسٹر اکڑ رہا تھا اور پتھر اپنی جگہ سے اکھڑنے لگے تھے تاہم یہ قصر مضبوط تھا، بے حد مضبوط تھا۔ اور پڑاؤ کی چوٹی پر اپنے برج اٹھائے ایک ابدی پاسان کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ مستحکم عظیم اور پر ہیبت کئی صدیوں کے بعد بھی یہ آج کے زمانے میں بھی اسرار لوگوں کے دلوں پر طاری تھے، بھول چکے ہوئے اور ان اسرار کو بھی فراموش کر چکے ہوئے جو اس کی سنگین چار دیواری میں بند ہیں کوئی نہ جانے گا کہ یہ کھنڈر ایک قصر تھا اور کسی کو معلوم نہ ہو گا کہ اس قصر کا مالک کون تھا؟

چارلس دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے کواڑوں کو آہستہ سے دھکیلا وہ کھل گئے۔ گزشتہ رات انہوں نے اس بڑے کمرے اور اپنی خوابگاہوں کے علاوہ اس قصر کا کوئی اور کمرہ نہ دیکھا تھا اور نہ ہی چارلس کو اس بات کی دھن تھی کہ وہ قصر اندرون کا کھوج لگائے چارلس نے تجسس طبیعت نہ پائی تھی اور اگر حالات مختلف ہوتے تو وہ قصر کے کمروں اور گزر گاہوں میں ٹاک جھانک کرنے کو بد اخلاقی سمجھتا، لیکن اس کا مالک زندہ نہ تھا اور وہ تھا ایک ملازم اسی پراسرار طریقہ سے غائب ہو گیا

اس نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے پردے کا ایک حصہ ذرا سا ہٹا دیا، دوسری طرف ایک تاریک دروازہ تھا جس کے کواڑ نہ تھے اس دروازہ سے ایک زینہ شروع ہو کر کہیں نیچے چلا گیا تھا اوپر کی چند سیڑھیاں گزر گاہ سے آتی ہوئی روشنی میں نظر آ رہی تھیں اور بعد کی سیڑھیاں گھپ اندھیرے میں گم تھیں۔

ایلن اس گزرگاہ میں چلتا ہوا اسی طرف آیا ہوگا اور اسے بھی پردے کے پیچھے دو بار میں یہ دروازہ مل گیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اسے اپنی خوابگاہ میں سے نکلنے اور یہاں تک آنے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟ اور وہ یہاں تک کیوں آیا تھا؟ اگر آیا تھا تو بچے کیوں گیا تھا اور ہیلن بھی اس کے پیچھے پیچھے کیوں گئی؟

چارلس جہاں تھا وہیں شش و پنج کے عالم میں کھڑا رہا۔ وہ اس زینے کے ذریعہ نیچے اترنے سے ہچکچا رہا تھا، ایلن اور ہیلن اسی راستہ سے جا کر غائب ہو گئے تھے نیچے کے کمرے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی عفریت کوئی بلا جس نے ان دونوں کو کسی طرح اپنی طرف کھینچ لیا تھا اور پھر انہیں نگل لیا تھا بہت ممکن تھا کہ وہ بلا سے یا جو کچھ بھی وہ تھا۔ اب بھی اس زینہ کے قدموں میں موجود ہو اور اپنے بھی وہ بھوکا اور

پاماسا ہو۔

لیکن وہ کیا ہو سکتا تھا؟ اس ویران اور غیر آباد قصر کے = خانہ میں کون ہو سکتا تھا؟ وہ دل کڑا کر کے دینے کی طرف بڑھا۔

دروازہ نچا تھا چنانچہ چارلس کمر میں سے ذرا جھک گیا کہ اس کا سر محراب سے ٹکرائے جانے لگا۔ وہ دھڑکتا دل لئے ٹیکڑیاں اترنے لگا چند سیڑھیوں کے بعد اوپر سے آگئی ہوئی روشن غائب ہو گئی لیکن آگے کی سیڑھیاں پھر روشنی تھیں اوپر چھت میں

آئے، یہ ایک لاوارث اور ترک شدہ عمارت تھی اس کے باوجود۔۔۔ اس میں قاتلین بچے ہوئے تھے، دیواریوں سے پروے لٹک رہے تھے، اور گزشتہ کی مٹی خلی منزل کے پردے کمرے کے آستان میں نہ صرف آگ جل رہی تھی، بلکہ ان چاروں مسافروں کے لئے کھانا بھی تیار کیا گیا تھا، اور چارلس کی عقل اس معرکہ کو حل کرنے سے قاصر تھی۔

اس نے قصر کے باورچی خانے میں جانے کا فیصلہ کیا یقیناً وہاں سے یہ سرخ توپ ہی جائے گا۔ کہ گذشتہ رات وہاں کھانے پکانا گیا تھا شاید کلیو پھر نمودار ہو جائے، شاید اسے بولنے پر مجبور کیا جاسکے اور وہ اس راز پر سے پردہ اٹھا سکے اور چارلس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ اگر اس کی بیڑ بیڑ کلیو سے ہو گئی تو وہ اسے مجبور کر دے گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو وہ تشدد سے بھی کام لے گا۔۔۔ بہر طور وہ کلیو سے یہ راز اکوالے گا۔

وہ گزرگاہ میں چل پڑا ایک دیوار پر کا پردہ آہستہ آہستہ تقریباً نامعلوم طور پر چل رہا تھا۔ اوپری منزل تقریباً تنگی تھی البتہ کہ محض "رسم" اس میں سجاوٹ کی چند چیزیں رکھ دی گئی تھیں اور یہ پردہ انہی چند چیزوں میں سے ایک تھا۔ قصر کی اس منزل میں آنے والے کے دل میں لامحالہ یہ خیال گزرتا تھا کہ اس منزل کے تمام کمروں کے "سوائے ان دو خوابگاہوں کے جن میں چارلس اور اس کے ساتھیوں کا قیام رہا تھا" تصدا" سجاوٹ اور فرنیچر وغیرہ سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اور ان چیزوں کو اس بڑے کمرے میں سجایا گیا تھا۔ جہاں بیٹھ کر چارلس اور اس کے ساتھیوں نے گزشتہ رات کھانا کھایا تھا۔

چارلس کے قدم رک گئے۔

پروہ بدستور مل رہا تھا اور سرد ہوا اس کے ٹخنوں سے لپٹ رہی تھی، حالانکہ اس طرف ایک بھی کھڑکی نہ تھی اور اگر تھی بھی تو وہ بند تھی، اس کے علاوہ گزر گاہ مینا

وہ ایک طرف ہٹ گیا لاشعوری طور پر وہ بڑی خاموشی اور احترام سے چل رہا تھا بالکل اسی طرح جس طرح ہم اور آپ کسی پرانے قبرستان یا مقبرے کے قریب سے گزرتے وقت خود بخود سر جھکا کر احترام سے چلنے لگ جاتے ہیں۔

مراسرہا۔

چارلس نے اپنے آپ کو سنبھالا اپنی قوت سمیٹی اور ایک ہاتھ بلند کر کے تابوت کا کنارہ پکڑ لیا۔ اپنے آپ کو اسی ہاتھ کے سہارے اوپر اٹھایا اور گردن بڑھا کر تابوت میں دیکھا۔

تابوت میں ایک شخص اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے چپ لیٹا ہوا تھا۔ اس نے سیاہ لبادہ پہن رکھا تھا جس پر خون کی سرخ رنگ کی دھاریاں تھیں اور اس کے ہاتھوں کی لمبی اور پتلی انگلیاں نہ تھیں بلکہ وہ کسی خونخوار اور بیدرد شکاری کے پنجے تھے۔ اور اس کا چہرہ وہ بھی ایسا نہ تھا۔ جیسا کہ کسی مردے کا ہوتا ہے۔ یعنی نورانی اور پرسکون اس کا چہرہ لمبوتر اور ستا ہوا تھا۔ اور اس سے بڑی سفاکی عیاں تھی یہ ابدی نیند سوئے ہوئے کسی نیک مرد کا نہیں بلکہ کسی ظالم اور سفاک چہرہ تھا۔ ایسے شخص کا جس کے سینہ میں دل نہ ہو اور جو شکار خور ہو۔ اس کے ہونٹ پٹے تھے اور بالائی ہونٹ کے دونوں کونے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے کیونکہ وہاں سے دو لالہ بنے اور نیلے دانت، بھیڑیے کے دانتوں کے سے تھے اور باہر کو نکلتے ہوئے تھے۔ یہ ایک پر رعب چہرہ ہو سکتا تھا، شیطانیت نے اس پر اپنے پنجے اس بری طرح گاڑ رکھے تھے کہ اس تابوت میں سوئے والے کا چہرہ بے حد بھیاںک اور لرزہ خیز بن گیا تھا۔

مردے ہوئے گوشت اور خون کی جلی آمیز بو کے پیچھے اس شخص کے منہ سے گل رہے تھے۔

چارلس کے قدم ڈمگائے اس کے ہاتھوں اور پیروں سے جان سرکنے لگی اور اس کی گرفت تابوت کے کنارے پر سے ڈھیلی پڑ گئی اور کنارہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

عین اس وقت تابوت والے نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔

لاش ایسی ہو گئی تھی کیوں کہ اگر ایسا ہی ہوتا تو نہ صرف ایلن کی لاش خود اس کے خون میں لت پت ہوتی بلکہ صندوق بھی خون سے بھر گیا ہوتا لیکن ایسا نہ تھا ایلن کے لباس پر اور صندوق کی دیواروں پر خون کے چند موٹے قطرے سے تھے اور بس۔

چارلس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبایا، منہ سختی سے بند کیا۔ اور کمر میں سے دھرا ہو گیا۔ وہ تھے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی سلاخیں تن گئی تھیں۔

آخر کار وہ اپنی ساقے روکنے میں کامیاب ہو گیا، وہ بری طرح سے ہانپ رہا تھا۔ اور اس کے ماتھے سے ٹھنڈا پھیند بہہ کر اس کی آنکھوں میں داخل ہو رہا اور جلن پیدا کر رہا تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے ایک ہاتھ بڑھایا اور دھڑے صندوق کا ڈھکن بند کر دیا۔

چارلس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا، لیکن ٹانگوں نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس نے پہلا ہی قدم اٹھایا تھا کہ وہ لڑکھڑا گیا، جھکا اور دونوں ہاتھ بڑھا کر تابوت کی چوکی کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے دماغ میں خشک صحرائی گولے ناچ رہے تھے اور تابوت کی چوکی پر کندہ حروف اس کی نظر کے سامنے ناچ رہے تھے۔

اور عین اسی وقت تابوت میں 'اور چارلس کے جھکے ہوئے سر کے عین قریب' کسی چیز نے حرکت کی۔

چارلس جس حالت میں تھا اسی حالت میں بت بن گیا۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ تابوت میں کسی چیز نے حرکت کی تھی، یہ ناممکن تھا یہ شاید اس کا وہم تھا۔ یہ آواز شاید اس کے دماغ میں پیدا ہوئی تھی یا شاید اس کے کان بج رہے تھے۔

وہ آواز پھر سنائی دی کسی کے پہلو بدلتے کی مدہم آواز۔ کسی کے لباس کی ہلکی سی

باب-۶

بست سی چنگاریاں بے شمار جگنوؤں کی طرح ہلکے سے چٹائے کی آواز کے ساتھ جھونپڑی کی فضا میں بکھر گئیں اور لکڑیوں نے کڑوا اور زرد رنگ کا دھواں اٹکھڑا۔ جو ڈانکا کی آنکھوں اور منہ میں جا گھسا اس کی آنکھوں میں سے جلن کے ساتھ پانی بہہ آیا اور وہ کھانسنے لگی۔

وہ جھونپڑی کے ایک کونے میں پچھلے کئی منٹوں سے آگ جلائے کی کوشش کر رہی تھی کہ آگ اور روشنی ہو تو اس کی ڈھارس بندھ جائے لیکن لکڑیاں گیلی تھیں اور جھونپڑی میں ہوا نہ آ رہی تھی کہ انہیں پٹکھا جھل کر بھڑکا دیتی۔ ڈانکا تھک کر اکڑوں بیٹھ گئی۔

باہر دن ختم ہو رہا تھا اور روشنی غائب ہو رہی تھی۔ جھونپڑی میں ابھی سے اندھیرا گھس آیا تھا اور ننھے سے الاؤ سے اٹھتا ہوا دھواں اس اندھیرے کو اور بھی گاڑھا کر رہا تھا۔ فضا سرد ہو چلی تھی لیکن ڈانکا کو گرمی کی اتنی ضرورت نہ تھی۔ جتنی روشنی کی سردی تو بہر حال وہ برداشت کر سکتی تھی، لیکن اندھیرے کو نہیں کیونکہ جیسے جیسے اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اس کے دل میں خوف اترتا جا رہا تھا وہ اندھیرے سے کبھی خوف زدہ نہ ہوئی تھی۔ لیکن یہاں خدا جانے کیا بات تھی کہ وہ اندھیرے سے ڈرنے لگی تھی، اس بچے کی طرح جسے اس کی ماں نے شرارت کی سزا دینے کے لئے یا غلطی سے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا ہو، ڈانکا کا خوف بڑھتا ہی جا رہا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اندھیرا اترتے ہی کچھ ہوگا۔ شاید تاریکی کے دیوتا اور بلائیں نکل کر اسے نگل لیں گی۔

وہ ایک بار پھر بچھتی ہوئی آگ پر جھک گئی کہ پھونکیں مار مار کر اسے بھڑکا دے

کونٹ ڈرکولا بیدار ہو چکا تھا۔ اور اب وہ اٹھ رہا تھا۔ پاگل کتے کی سی ایک بھیاںک جھج سے غارتے کی فضا لرزائی یہ چارلس تھا۔ جو چیخا تھا۔ دھنچا اس کے ہاتھ گھٹنوں میں سے کٹ گئے اور وہ دھڑم سے گرا۔ لیکن پھر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں فرش پر ٹیک کر جیسے بڑی تکلیف سے اٹھ کر گھٹنوں کے بیٹھ گیا۔ پھر دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر بڑی کوشش کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ اور لڑکھڑاتے قدموں سے زمین کی طرف بھاگا۔

اور اب وہ شرابیوں کی طرح جھومتا اور ٹھوکریں کھاتا چکر دار زینہ چڑھ رہا تھا۔



طرف دیکھا، ایک طویل القامت انسانی سایہ دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔

ڈانکا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

کلیو نے کہا۔ ”خاتون! ایک بار پھر میں نے آپ کو خوفزدہ کر دیا جس کی میں معافی چاہتا ہوں۔“

”کلیو تم؟“

”جی ہاں۔ یہ میں ہی ہوں۔“

”تم۔۔۔ تم۔۔۔ یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

”آپ کو لینے آیا ہوں خاتون“

”مجھے۔“

”جی ہاں، آپ کے شوہر نے مجھے بھیجا ہے۔“

”چارلس نے؟“

جی ہاں۔ انہوں نے مجھے بتکھی لے کر یہاں بھیجا ہے کہ آپ کو ان کے پاس پہنچا دوں۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ۔۔۔“

”آپ کے شوہر سب کچھ سمجھا دیں گے۔“

کلیو ایک بار پھر وہی گزشتہ رات والا کلیو تھا۔ فرماں بردار اور مہمانوں کا احترام کرنے والا۔ وہ جموئیزڈی کا ٹوٹا ہوا کواڑ اس طرح پکڑے کھڑا تھا جیسے یہ کسی آرام دہ تھوٹی کمرے کا دروازہ ہو جس کے دو سری طرف ایک وسیع و عریض کمرے میں پردے اور بار سونے ہستی ڈانکا کی منتظر ہو۔

”لیکن ایلیں کہاں ہے؟“ ڈانکا نے ایک دم سے پوچھا۔ ”کہاں گیا وہ اور اس کی بیوی بھی؟“

کچھ تو روشنی ہو۔ اس کے دل سے ذرا سا خوف دور ہو۔

لیکن ابھی وہ جھکی ہی تھی کہ دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی وہ اٹھ کر کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور وہاں جالوں کی جھالیں لٹک رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر جالے گھسیٹ لئے اور پھر کھڑکی کے شیشوں پر ہتھیلی پھیر کر اس پر سے چٹائی کے دھبے مٹائے اور چوراہے کی طرف دیکھا۔

ٹاپوں کی آواز زیادہ سے زیادہ قریب آئی جا رہی تھی۔۔۔ اور پھر اسے وہ نظر آگئے۔ وہی کالے گھوڑے جو بکھی کو کھینچ رہے تھے گھوڑے وہی تھے جو گزشتہ رات آئے تھے بکھی وہی تھی جس میں گزشتہ رات وہ چاروں سوار ہوئے تھے اور جو انہیں قمر تک لے گئی تھی۔

ڈانکا نے کھڑکی کے شیشے سے اپنی ناک لگادی اور غور سے دیکھنے لگی۔

بکھی آگے بڑھی، اس کی زلفاں کم ہونے لگی اور وہ چوراہے پر پہنچ کر رک گئی گھوڑوں نے ایک جھرجھری لے کر اپنے بدن جھٹکے، سر ہلائے اور بے حرکت کھڑے ہو گئے، ڈانکا ایک طرف کھسک کر کھڑکی کے کنارے پر کھڑی ہو گئی اس زاویے سے اسے پوری بکھی نظر آتی تھی۔

بکھی پر کوئی کوچوان بیٹھا ہوا نہ تھا۔

گھوڑے آپس میں تھو تھنہٹاں رگڑ رہے تھے اور زمین پر ٹاپیں مار رہے تھے وہ خاموش کھڑے تھے اور بکھی بھی منتظر کھڑی تھی، اس کے آتے ہی فضاء پر ہول بن گئی تھی۔ خاموشی اور بھی گہری ہو گئی تھی جیسے عناصر بھی دم بخود اور سسے ہوئے ہوں۔

ڈانکا کے دل میں ایک عجیب طرح کا خوف بڑھنے اور پھیلنے لگا اور پھر وہ ناقابل برداشت بے چینی میں تبدیل ہو گیا وہ کھڑکی کے قریب سے ہٹ آئی۔

فوراً ہی ہلکی سی آواز کے ساتھ جموئیزڈی کا دروازہ کھلا ڈانکا نے چونک کر اس

”میں نے عرض کیا نا خاتون کہ آپ کے شوہر سب کچھ سمجھا دیں گے“ اور وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

ڈانٹا نے سوچا کہ گزشتہ رات کلیو کی مہماں نوازی کسی خاص مقصد کے تحت تھی، اس کا سلوک جو بظاہر بڑا اطمینان بخش اور قابل تعریف تھا، دراصل بڑا ہی عیارانہ تھا اور اس کی شائستگی اور خوش خلقی بڑی ہی گستاخانہ تھی اس شخص پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اسے احساس تھا کہ اسے کہیں نہیں جانا ہے۔ اسے وہیں رہنا ہے، جہاں وہ اس وقت ہے لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ چارلس قصر میں تھا۔ اور اس کلیو کو بھیج دیا تھا کہ وہ ڈانٹا کو لے آئے اور۔۔۔۔۔

”خاتون! پہلئے۔ آپ کے شوہر خنجر ہیں۔“ کلیو نے کہا۔

اور وہ بے اختیار دروازے کی طرف بڑھی جیسے وہ اپنی مرضی کی مالک نہ رہی ہو۔ کلیو ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور جب ڈانٹا اس کے قریب سے گزری تو وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔

”وہ تبھی میں سوار ہو گئی۔ کلیو خاموشی سے کوجوان کی جگہ جا بیٹھا اور اس نے لگائیں اپنے ہاتھوں میں لے کر گھوڑوں کا رخ موڑ دیا اور ایک بار پھر تبھی اس راستہ پر چل پڑی جو قصر ڈیکولا کی طرف جاتا تھا، ڈانٹا کو کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ اس جنگل میں اور پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوئے قصر ڈیکولا میں کوئی خاص بات تھی۔ کوئی آسیب تھا۔

تبھی بے حد عمدہ اور آرام دہ تھی اور اس واقعہ اس کی رفتار بھی مناسب تھی گزشتہ رات کی بد نسبت بے حد کم رفتار تھی۔ ڈانٹا کو بڑی عزت و احترام سے اسی گھر کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ جہاں صرف چوبیس گھنٹوں پہلے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا گیا تھا۔

خندق کے پل پر کے تختے گھوڑوں کی ٹاپوں اور پھر تبھی کے پیوں کی کھڑکڑاہٹ سے بچ اٹھے، اور یہ آواز قصر کی محرابوں میں گھس کر اور آواز بازگشت پیدا کر کے ڈوب گئی۔ تبھی محسن میں پہنچ چکی تھی تبھی ابھی پوری طرح رکی بھی نہ تھی کہ کلیو کوجوان کی نشست پر سے نیچے کود آیا اور اس سے پہلے کہ ڈانٹا ”اتر دو یا نہ اتر دو“ کا فیصلہ کر پاتی، وہ تبھی کا دروازہ اس کے لئے کھولے مودب کھڑا تھا۔

”اس طرف خاتون۔“ اس نے کہا۔

اور پھر کمر میں سے اس حد تک جھک گیا، کہ ڈانٹا کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کلیو اس کا مذاق اڑا رہا ہو یا اسے بتا رہا ہو۔

بہر حال وہ تبھی میں سے اتر آئی اور قصر کے صدر دروازے کی طرف چلی، کلیو اس کے پیچھے تھا لیکن جب ڈانٹا نے دروازہ کھولنے کے لئے اپنا ہاتھ لبا کیا تو کلیو اک دم سے اچھل کر اور حیرت انگیز پھرتی سے آگے بڑھ آیا اور اس سے پہلے کہ ڈانٹا کی انگلیوں کی پوریں کواڑ کو چھوئیں کلیو اس کے لئے دروازہ کھول چکا تھا۔

ڈانٹا خاموشی سے آگے بڑھی اور دروازے میں سے گزر کر قصر کے بڑے کمرے میں داخل ہو گئی۔ فوراً ہی دروازہ بڑے زور سے بند کر دیا گیا اس کے بند ہونے کی آواز سے ڈانٹا کا دل قلا بازی سی کھا گیا اور وہ کلیو کو سرزنش کرنے کے لئے اس کی طرف گھوم گئی۔

لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ کلیو قصر کے باہر ہی رہ گیا تھا۔

ڈانٹا ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ دروازے پر جا پڑی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کواڑ پر لگا ہوا پرانی طرز کا دست پکڑ لیا اور اپنے نازک جسم کی پوری طاقت صرف کر کے اسے کھینچا۔ دروازہ مضبوطی سے بند تھا چنانچہ وہ نہ کھلا۔

”کب سے ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔“ ایک آواز نے کہا۔

ہیلن بیٹھ سے مغرور اور خود پسند عورت تھی اور اکثر دفعہ اس کے بشرے سے اسکول کی استانیوں کی سی حماکت ٹپکنے لگتی تھی ڈانٹا نے اکثر ہیلن کے بشرے پر یہ حماکت اور کرختگی دیکھی تھی لیکن اس وقت اس کے بشرے سے جو جذبات میاں تھے وہ بالکل نئے تھے۔ کم سے کم ڈانٹا ان سے واقف نہ تھی۔ کینہ اس کے چہرے پر جیسے بھجھو کر رہ گیا تھا اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ عیارانہ چمک جس سے شیطانیت جھانک رہی تھی ہو اس ناگن کی طرح نظر آ رہی تھی جو بچن پھیلا چکی ہو اور کوئی دم میں ڈسنے والی ہو۔

”معاملہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ ڈانٹا نے کہا۔ ”کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔“

”کچھ۔۔۔ ہیلن! ایلن کہاں ہے؟“

”گھبراؤ نہیں۔ آؤ۔ میرے قریب آؤ۔ میری اچھی بہن آؤ۔“

اور ہیلن نے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بیٹھا دیا۔ ڈانٹا ایک دم سے پیچھے ہٹ گئی۔

”چارلس کہاں ہے؟“ ڈانٹا نے پوچھا۔

”چارلس! آ۔ ہاں۔۔۔ اب اس سے تمہیں کیا واسطہ؟“

ڈانٹا نے کوشش کی کہ اپنے بشرے سے ان جذبات کا اظہار نہ ہونے دے جنہوں نے اس کی دل میں ایک طوفان اٹھا رکھا تھا۔ اسے شدت سے احساس تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ جو اس کے سامنے کھڑی ہوئی ہے ایلن کی بیوی نہیں ہے۔ وہ ہیلن نہ تھی جس سے ڈانٹا واقف تھی۔ وہ دھتتا ”بدل گئی تھی۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ کچھ اور بن گئی تھی چنانچہ اس کے قریب جانا خطرناک تھا اس کمرے میں ٹھہرنا خطرناک تھا۔

ڈانٹا نے نظروں سے اپنا اور ہیلن کا درمیانی فاصلہ نپا اور پھر پلٹ کر بھاگ پڑی۔ ایک بھیانک اور وحشت انگیز قہقہہ کمرے میں گونج گیا یہ ہیلن تھی جو دیوانوں

یہ پرسکون آواز تھی۔ لہجہ ایسا تھا جیسے بچوں کو ہلانے اور پھسلانے کے لئے بزرگ استعمال کرتے ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ یہ آواز ڈانٹا کے لئے انجانا نہ تھی۔

”ہم سوچ رہے تھے کہ تم آؤ گی بھی یا نہیں۔ بہت انتظار کروایا۔“ اس آواز نے کہا۔

ڈانٹا آواز کے طرف محو مگنی۔

دینے کے قریب کوئی اور نہیں بلکہ خود ہیلن کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے چمکدار ریشمی بال اس بری طرح سے بکھرے ہوئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا اسے ابھی چند منٹوں پہنچری گئی نیند سے جبراً بیدار کیا گیا ہو۔ ہیلن فطرتاً تند خو اور سخت قسم کی عورت تھی۔ لیکن خدا جانے کیا بات تھی کہ اس وقت اس کے یہ جذبات اس کے بشرے سے اس طرح نمایاں تھے کہ اس کا چہرہ بگڑ کر بھیانک بن گیا تھا اور وہ بڑی ہی بیدار اور ظالم نظر آتی تھی۔

لیکن اس کی آواز۔۔۔۔۔ وہ بڑی مصوم تھی اور پھسلانے والی۔

”ڈانٹا! بڑی راہ دکھائی تم نے۔“ وہ بولی۔

ڈانٹا نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ اس کی ساری پریشانی اور خوف دھتتا ”دور ہو گیا۔“ ایک اس کے تھے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور وہ عجیب طرح کی نقابت محسوس کرنے لگی۔ تاہم اس کی جی چاہ رہا تھا۔ کہ وہ خوب ہنسے اور وہ بیوقوفوں کی طرح ہنس کر ہیلن کی طرف بڑھی۔

”چارلس کہاں ہے؟“ اس نے کہا بے حد شکر اور پریشان تھے ہم۔ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ۔۔۔۔۔“

ڈانٹا جملہ پورا نہ کر سکی۔ اس کی آواز حلق میں ہی ڈوب کر رہ گئی۔

کی طرح قہقہے لگا رہی تھی اور اس کے یہ کھوکھلے اور غیر ارضی قہقہے ڈانکا کا خون منہ پر کر رہے تھے۔

دروازہ کھلا تھا، ڈانکا اس کی طرف یوں بھاگی جیسے اس کے پیچھے دونوں کی عنقریب لگ گئی ہوں وہ دروازے کے قریب پہنچ گئی اور۔۔۔ ایک کالے سائے نے اس کا راستہ روک لیا ایک طویل القامت اور دھڑلا چلا شخص، جس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا جس پر سرخ دھاریاں تھیں بڑی پھرتی مگر ایک رقصہ کی سی اداسے یا اس نازک مزاج قاتل کی طرح جو اپنا شکار منتخب کر رہا ہو اس کے سامنے آکر اُٹھا۔

ہیلن بدستور قہقہے لگا رہی تھی۔

ڈانکا کا راستہ روک کر کھڑے ہوئے شخص کا لباس اس کے پیچھے یوں اڑ رہا تھا کہ وہ کسی بڑی سی چمکاوڑ کے دو بازو معلوم ہوتے تھے دوپٹے اور لائے ہاتھ ڈانکا کی طرف بڑے اور شکاری پرندے کے سے بچوں نے اسے دوچ لیا۔

ڈانکا کو دوپٹے والے کا چہرہ کسی مردے کا چہرہ تھا سا ہوا بے رنگ اور کرخت اور ڈانکا اس چہرے پر اندھا دھند گھونے چلا رہی تھی لیکن ان گھونٹوں کا اس کا میاب شکاری پر کچھ بھی اثر نہ ہوا، حتیٰ کہ اس نے پلک تک نہ جھپکی اور اس کی گرفت ذرا بھی ڈھیلی نہ ہوئی۔ اس نے ڈانکا کو بڑی آسانی سے گھسیٹ کر قدرے اوپر اٹھالیا۔ اس کے پیر فرش سے اوپر اٹھ گئے اور اب وہ ڈانکا کو کچھ گھسیٹتے ہوئے اور کچھ اٹھائے ہوئے زینے کی طرف چلا۔

”ڈوریکولا!“ چھوڑ دو اس لڑکی کو۔“

اور ڈانکا خوشی سے رو پڑی۔ اس کے منہ سے ہلکی نکل گئی، کیونکہ یہ کسی اور کی نہیں بلکہ اس کے اپنے چارلس کی آواز تھی۔ وہ بدقت تمام ایک طرف گھوم گئی کہ اپنے چارلس کو دیکھ سکے۔

ہیلن نے جس فوری طور سے ہنسا شروع کیا تھا اس فوری طور سے وہ خاموش ہو گئی اور پہلو کے اس دروازہ کی طرف بھاگی جس دروازے سے چارلس نکل آیا تھا۔ اس نے چارلس کے قریب پہنچ کر اس کا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔

”چارلس! میرے بھائی!“ لاؤ میں تمہیں چوم لوں۔“ ہیلن نے کہا۔

چارلس ہیلن کی طرف نہیں بلکہ اپنی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ تو ہیلن اس سے لپٹ گئی۔ اوہر ڈوریکولا ڈانکا کو اپنی گرفت میں لئے تھا اور خود ڈانکا اپنی آپ کو چھڑانے کے لئے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔

ہیلن نے اپنا سر چارلس کے ماتھے یا رخسار کی طرف جھکانے کے بجائے یہ کیا کہ اپنی گردن ذرا ٹیڑھی کر لی اور اب اس کا سر آہستہ آہستہ چارلس کی گردن پر جھکنے لگا۔ لیکن اس کا یہ عمل کچھ ایسا عیارانہ اور حیوانی سا تھا کہ چارلس ایک دم سے چونکا اور اس نے گھوم کر ہیلن کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ اس کے بشرے سے عجیب طرح کی خوفناوری عیاں تھی اور اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ کھل رہے تھے اور اس کے دو ٹکیلے اور لائے دانت نمودار ہو رہے تھے۔

کچھ اور تو چارلس کی سمجھ میں نہ آیا۔ البتہ اس نے ہیلن کو ایک دھکا دے دیا وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی اور پھر فرش پر گری۔

اوہر ڈانکا نے ایک آخری کوشش کی اور زور مار کر ڈوریکولا کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔ موخر الذکر نے اپنے لائے اور پٹے ہاتھ اس کی طرف چلائے تو وہ چارلس کی طرف بھاگی۔ وہ صرف یہ ہاتھی تھی کہ اپنے شوہر کے سینے سے لگ جائے اور اس کی بانہوں میں اس وقت تک سٹکی رہے جب تک کہ یہ بھیانک خواب پریشان غائب نہ ہو جاتا، کیونکہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ ڈانکا کے لئے حقیقت سے زیادہ ایک خواب پریشان ہی تھا، لیکن بجائے اس کے کہ چارلس اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتا۔ اس نے ڈانکا

کو پکڑ کر اپنے پیچھے ڈھکیلا دیا اور ڈریکولا کے چہرے پر اپنی نظریں بدستور جمائے رکھیں۔

”ڈائنا فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔“ چارلس نے کہا۔
”نہیں۔“

• ”جاؤ۔“ کبھی میں سوار ہو کر بھاگ نکلو۔“

”نہیں۔ میں تم کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

”جیسا میں کہتا ہوں، ایسا ہی کرو۔ ڈائنا! جاؤ۔“

ڈریکولا ان کی طرف بڑھا۔ وہ ذرا بھی پریشان اور گھبرایا ہوا نہ تھا اس کے بر خلاف وہ مطمئن تھا۔ اس بلی کی طرح جس نے دو چوہے دیوچ رکھے ہوں، وہ اجساد سے کانپ رہا تھا اگر ایک شکار فرار ہو گیا تو دوسرا نہ بچ سکے گا۔ وہ آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا۔ بشرطیکہ ہم اسے مسکراہٹ کہہ سکیں کیونکہ اس کے ہونٹوں کا یہ کھنچاؤ بڑا ہی لرزہ خیز تھا۔

ڈائنا جانے کے لئے تیار نہ تھی، لیکن چارلس نے اپنا ایک ہاتھ خاموشی سے دروازہ کی طرف اٹھا دیا۔ اور ڈائنا بڑی فرمانبرداری سے دروازے کی طرف پلٹ گئی اس کے اور دروازے کے درمیان اس بڑے کمرے کی وسعت تھی جو ڈائنا کو ایک وسیع اور افقی تک پھیلے ہوئے میدان کی طرح معلوم ہو رہی تھی اور اس وسعت میں کہیں کوئی جائے پناہ نہ تھی۔
وہ دروازے کی طرف بھاگی۔

فوراً ہی ہیلن کا خون منجمد کر دینے والا قہقہہ گونج گیا ہیلن نے ڈائنا کا ایک ہانڈ پکڑ لیا۔ آہنی گرفت تھی اس کی، اس نے ڈائنا کو بڑی بیدردی سے پیچھے کی طرف دھکیلا اور دیوار تک دھکیلتی چلی گئی اور اب ڈائنا کی پیٹھ سے دیوار سے لگ چکی تھی اور

ہیلن اسے دیوچے ہوئے تھی۔

اور ڈریکولا چارلس کے قریب پہنچ گیا۔

چارلس نے اس کی طرف گھونٹ چلا دیا۔ ڈریکولا نے ایک طرف ہٹ کر اس کا وار بچایا اور پھر اپنا سر جھکا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے چارلس کی کمر پکڑی اور اسے بڑی آسانی سے، جیسے وہ ایک ڈیڑھ برس کا بچہ ہو اور اٹھا لیا۔ اس سے پہلے کہ چارلس کچھ کر سکتا ڈریکولا نے اسے اچھال کر پھینک دیا۔ چارلس ہوا میں حیرتا ہوا سامنے والی دیوار سے بڑی زور سے ٹکرا گیا اس کا بھیجاہل گیا، نظر کے سامنے رنگ برنگ پیلے سے ناچ گئے اور پھر وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ڈریکولا کے منہ سے بھیر پڑنے کی غراہٹ کی سی آواز نکلی اور وہ چارلس کی طرف بڑھا۔

چارلس نے اپنا سر جھکا، دونوں ہاتھ گھٹنوں پر ٹیکے اور دیوار سے پیٹھ لگائے بلکہ یوں کہیں کہ دیوار پر پیٹھ گھسیٹا آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور کسی ہتھیار کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

چند فٹ دور ایک رنگ آلود تلوار پڑی ہوئی تھی ایک سیکنڈ پہلے یہ تلوار دیوار پر تکی ہوئی تھی لیکن چارلس دیوار سے اس زور سے ٹکرایا تھا کہ وہ کیل میں سے نکل کر فرش پر آگری تھی، چارلس اپنے پہلو پر لڑھک گیا اور ہاتھ بڑھا کر تلوار کا دستہ پکڑ لیا، وہ جلدی سے اٹھا اپنی ٹانگیں ذرا چوڑی کر لیں کہ توازن برقرار رہے اور اب وہ خطر کھڑا تھا تلوار کی نوک آگے بڑھتے ہوئے ڈریکولا کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

ڈائنا ہیلن کی گرفت سے آزاد ہونے کی دیوانہ وار کوشش کر رہی تھی لیکن ہیلن اسے برابر دیوچے جاری تھی اور پھر دونوں عورتیں لمبے بحر بعد چارلس اور ڈریکولا کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

لن دونوں کی نگرہونے والی تھی۔

چارلس نے کچکا کوار ڈریکولا کی طرف جھونک دی سرخ دھاریوں والا کالا کاپڑ
کسی بڑے سے پرندے کے بازوؤں کی طرح پھڑپھڑایا۔ اور اس نے فضا میں ایک کالا
بمبور سا پیدا کر دیا۔ ڈریکولا وار بچا گیا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ وہ کوار کا پھل بھی
اپنے ہاتھ میں پکڑ چکا تھا۔ چارلس نے کوار کو کھا کر تھینے کی کوشش کی، تاکہ گرفت
سے چھڑا کر دوسرا اور بھرپور وار کر دے۔



چارلس زور آزمائی کر رہا تھا اور کوار ڈریکولا کی ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کر رہا
تھا۔ کوار کا پھل ڈریکولا کے ہاتھ میں گھوم رہا تھا اور اس کی ڈریکولا کی انگلیوں کے
درمیان سے خون ٹپک رہا تھا، کوار کی دھار ڈریکولا کی ہتھیلی میں ہڈی تک پہنچنے کے
لئے راستہ بنا رہی تھی لیکن خود ڈریکولا مسکرا رہا تھا۔

اس نے ایک زور کا جھٹکا دیا اور کوار چارلس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔
ڈریکولا کے منہ سے ایک بار پھر غراہٹ کی آواز نکلی اس نے کوار دونوں ہاتھوں
میں پکڑ کر اوپر اٹھائی اور پھر ”تڑاخ“ سے یوں توڑ دی جیسے وہ فولادی کوار نہیں بلکہ
نلک منی ہو۔ اس نے کوار کے دونوں ٹکڑے اپنے قدموں میں پھینک دیئے اور
اب اس نے بڑے یقین سے، بڑے اطمینان سے اور قہمندانہ غراہٹ کے ساتھ اپنے
دونوں ہاتھ چارلس کی طرف بڑھائے اور دوسرے ہی لمحے اس کی گردن ڈریکولا کے
بیدار اور خونخوار پنجوں میں پھنسی ہوئی تھی ڈریکولا اس کا گلا دبانے لگا۔

چارلس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور جھک گیا اور آہستہ آہستہ بیٹھنے لگا لول تو
اس لئے کہ ڈریکولا کا تمام بوجھ اس پر پڑ رہا تھا اور دوم اس لئے کہ اس کا دم گھٹ رہا
تھا اور وہ مر رہا تھا۔

ڈانکا کی ٹلک شکاف جچ سے قمر کی بے حس دیواریں کانپ گئیں وہ بیلن کی

آجائے۔ لیکن وہ ہوا میں اوجھڑا رہا تھا کہ وہ جاتے تھے۔

ڈریکولا مسکرا رہا تھا اس کے ہونٹ دانتوں پر کھینچ گئے تھے۔ آنکھوں میں سرخ موندے ڈورے پیدا ہو گئے تھے۔ اور وہ اس لمبی کی طرح ہولے ہولے غرا رہا تھا جو اپنے ڈکار سے کھیل رہی ہو۔

”چارلس۔۔۔ صلیب“ ڈانٹا چیخی۔

ڈریکولا چارلس کو جھنجھوڑ رہا تھا۔

”چارلس۔ صلیب بناؤ۔

اور وہ ڈریکولا اور چارلس کی طرف بڑھی لیکن چارلس نے نہ صرف اس کی آواز سن لی تھی بلکہ وہ اس کا مطلب بھی سمجھ گیا تھا وہ ایک طرف اس طرح جھک گیا کہ اس کا پورا بوجھ ڈریکولا کے ہاتھوں پر آ پڑا۔ کچھ جھک کر اور کچھ لٹک کا اس نے فرش پر سے ٹکوار کے دونوں ٹکڑے اٹھائے جو وہاں ڈریکولا نے پھینکے تھے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ دم گھٹ رہا تھا۔ اعضا بے جان سے ہو چلے تھے اور اس کے باوجود اس نے ٹکوار کے ایک ٹکڑے پر دو سرا ٹکڑا اس طرح رکھ دیا کہ ان دو ٹکڑوں نے صلیب کی ایک بے ڈھنگی سی شکل بنادی۔

اس کے بعد چارلس بدقت تمام سیدھا ہوا اور اپنی بے جان ہوتی ہوئی ٹانگوں پر اپنے جسم کا بوجھ سنبھال کر اس نے صلیب آہستہ آہستہ بلند کی۔

اور اب صلیب میں ڈریکولا کے سامنے تھی۔

ڈریکولا کی قمقمندانہ اور خواب ناک سی مسکراہٹ یکایک غصے کی غراہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے چارلس کو چھوڑ دیا اور گھبرا کر بے اختیار کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

ڈریکولا غصے اور احساس شکست سے پھنکار رہا تھا۔

گرفت سے آزاد ہونے کے لئے کسی پاگل عورت کی طرح جدوجہد کر رہی تھی۔ ہیلن اور ڈانٹا آپس میں ستم گستاخیں۔ یونہی کشی کرتے اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کرتیں ہونیں وہ دونوں کمرے کے عین بیچ میں آگئیں اس جدوجہد میں ڈانٹا کے لباس کی ایک آستین پھٹ گئی اور گریبان کے بن کچھ ٹوٹ گئے اور کچھ کھل گئے اور اس کا سینہ چھاتیوں کی اوپری گولائیوں تک عریاں ہو گیا چنانچہ کھلے ہوئے گریبان میں سے وہ سیاہ ریشمی دھاگا کے ٹپلے سرے سے ایک چھوٹی اور سنہری صلیب لٹک رہی تھی۔ یہ صلیب اور اس کی مرحوم ماں کی نشانی تھی۔ دھاگے کے سرے پر جھولتی ہوئی صلیب گھڑی بھر کے لئے ہیلن کے ہاتھ سے چھو گئی۔

ایک بھیاںک خون جمہد کر دینے والی چیخ مچ گئی اس دفعہ یہ ہیلن تھی جو چیخی تھی اس نے ڈانٹا کو گھبرا کر چھوڑ دیا اور لڑکھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ہیلن کی آنکھیں جیسے تکلیف سے پھٹ گئی تھیں، اس کا منہ کھلا تھا اور وہ بری طرح سے ہانپ رہی تھی۔

ڈانٹا بھی لڑکھڑا گئی وہ بھی منہ کھولے کمرے کمرے سانس لے رہی تھی اور یہ سوچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ ایک دم سے کیا ہوا۔ کہ ہیلن یوں چیخ پڑی جیسے کسی نے اس کی ہتھیلی پر دھکتا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو۔؟

اس نے کیوں گھبرا کر ڈانٹا کو چھوڑ دیا؟ اور پھر اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ اس نے وہ چھوٹی سی سنہری صلیب دو انگلیوں میں پکڑ کر اوپر اٹھائی۔

فورا ہیلن خوف سے فرار کر پیچھے ہٹ گئی۔

”چارلس۔!“ ڈانٹا نے کہا۔

چارلس کی آنکھیں حلقوں میں سے نکل پڑی تھیں اس کے دونوں ہاتھ تقریباً بے جان سے ہوا میں ہل رہے تھے کہ شاید ان کی گرفت میں کوئی چیز، کوئی ہتھیار

"ح-ح-ح-ح"

بکمی دور نکل آئی اور ڈر کیولا کو اندھیرے میں نکل گیا۔

رات کے اندھیرے اور میب مایوں کے پس منظر میں ایک اور زیادہ مگرا سایہ نظر آرہا تھا۔ یہ وہ سایہ بکھی تھی جس میں کالے گھوڑے جتے ہوئے تھے چارلس نے ڈانکا کو اٹھا کر کچوان کی نشست پر بٹھا دیا اور خود بھی اچک کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

تھے۔ کیونکہ وزنی بکھی بھی ان کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہی تھی۔
 اور پھر اچانک چوراہا سامنے نمودار ہو گیا۔ چارلس نے اپنے جسم کی پوری قوت
 صرف کر کے لگائیں کھینچ لیں۔ وہ گھوڑوں کو جوزف باؤ کی طرف موڑ رہا تھا۔
 لگاموں کے کھنچاؤ سے مجبور ہو کر اور دھول کا ایک پادل سا اڑا کر گھوڑے توڑ گئے
 لیکن بکھی نہ مڑی۔ جس نشست پر ڈانٹا بیٹھی ہوئی تھی اس کے عین نیچے سے ٹرانسے
 کی آواز سنائی دی اور ڈانٹا کو کچھ دھندلا سا احساس ہوا کہ بکھی کا ایک ٹوٹا ہوا پیسہ اپنی
 جگہ سے الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے کنارے تک چلا گیا۔ ایک لمحے تک وہ کہیں
 گرتی رہی۔ ایک لمحے تک جو اسے خوفناک حد تک طویل معلوم ہوا۔ وہ آسمان اور
 زمین کے درمیان معلق رہی اور پھر زمین اور بکھی کے نچلے حصے کی ٹکر ہو گئی۔
 ”خر۔ خر۔“ کی آواز بلند ہوئی، بکھی زمین پر جھک گئی۔ ایک اور ترانہ سنائی دیا اور
 ڈانٹا نشست پر سے لڑھک گئی۔

جیسے زمین و آسمان نے جگہ بدل لی، پوری دنیا گھوم گئی، ڈانٹا نے اپنے دونوں ہاتھ
 چلائے کہ اس چیز کا سارا لے لے جو وہاں نہ تھی، ایک اندھیرا تھا جس میں بخور سے
 پڑ رہے تھے۔

اور پھر وہ گری۔ چت گری سر سے لے کر اڑیوں تک جیسے کسی نے ایک تختہ پر
 جڑوا ہو، ایک زوردار اور عقیم ضرب جس سے اس کی ریڑھ کی ہڈی خرد ہو گئی۔
 اور پھر صیب اندھیرے نے اسے اپنی پیٹ میں لے لیا۔ پھر کچھ نہ تھا۔ سب کچھ
 گم تھا۔ حواس بھی اور قیاس بھی۔

لڑھکتا ہوئی بکھی خنق کے چوٹی پل سے ایک طوفان کی طرح گزر گئی چارلس
 بڑی بیداری سے گھوڑوں پر چابک برسا رہا تھا۔ اس پر جیسے بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ڈانٹا
 نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی اسے کچھ کہا قعر ڈرکیولا خطرناک تھا،
 پر اسرار تھا اور وہ اس سے جلد از جلد بہت دور پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ
 چارلس گھوڑوں کو یوں بے تحاشہ اس لئے بھگا رہا تھا کہ وہ بھی خد سے زیادہ خوفزدہ
 تھا۔ ڈانٹا کو احساس تھا اور وہ جانتی تھی کہ چارلس کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ
 ڈرکیولا انسان نہ تھا بلکہ کچھ اور تھا کیا تھا؟ اس کا جواب انہیں فی الحال نہ ملا تاہم اتنا تو
 انہیں معلوم ہی ہو چکا تھا کہ وہ عجیب اور مافوق الفطرت قوتوں کا مالک تھا اور یہ کہ اگر
 انہوں نے ذرا بھی سستی کا ثبوت دیا، گھوڑوں پر ذرا بھی رحم کیا تو ڈرکیولا اپنی قوتوں
 کے زور سے انہیں واپس قعر کی طرف نہ صرف موڑ دے گا بلکہ انہیں اس طرف بلا
 بھی لے گا اور پھر۔۔۔ خدا جانے کیا۔

رفار کم کئے بغیر بکھی موڑ مڑ گئی اور اس کے پیچھے جیسے احتجاجا پیچ اٹھے بکھی کسی
 جاندار کی طرح اچھل کود کر رہی تھی۔ جیسے اپنی سواریوں کو پھینک دینا چاہتی ہو۔ ڈانٹا
 کرنے سے بچنے کے لئے چارلس سے لپٹ گئی۔

”سڑاک۔ سڑاک“ چابک گھوڑوں پر برس پڑا اور وہ گردن توڑ تیزی سے وہ
 طویل دھلان اترنے لگے جو چوراہے تک جاتی تھی۔ بکھی ان کے پیچھے بھاگی آ رہی
 تھی۔

دھلان عمودی ہو گئی۔

اور اب چارلس کو ہوش آیا اور اسے احساس ہوا کہ لگائیں کھینچنے کا وقت آ گیا
 تھا۔ لیکن اب وہ دقت نکل چکا تھا۔ اسے بہت دیر کے بعد خیال آیا تھا وحشت زدہ
 گھوڑوں کو اب قابو میں لینا ممکن نہ تھا۔ خود گھوڑے بھی اپنے آپ کو نہ روک سکتے

باب - ۷

تھی۔ اس نے دیکھا کہ بکھی ٹوٹ چکی ہے لیکن ڈانکا اس سے لپٹی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ گھسیٹ رہی ہے اور گھوڑے اس ٹوٹی ہوئی بکھی اور ڈانکا کو گھسیٹے ہوئے قصر ڈریکولا کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ اور وہاں وہ دونوں خطر کھڑے ہوئے ہیں۔ وہی مفریت ڈریکولا اور وہی ڈائن ہیلن۔

چارلس کانپ گیا اور پھر اسے ڈانکا نظر آگئی۔

وہ چند گز کے فاصلے پر بے حس و حرکت ایک ڈمیری طرح پڑی ہوئی تھی چارلس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی اور اس کا ماتھا سرد ہو گیا۔ اپنی چیخ کو گلے میں ہی روک کر وہ ڈانکا کی طرف دوڑ پڑا۔ گرا اٹھا اور پھر اس کی طرف دوڑا جیسے جیسے وہ اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا اس کے دل میں بھیاں بھیاں اندیشوں کا جھوم بڑھتا جا رہا تھا۔

وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اس نے اوندمے منہ پڑی ہوئی ڈانکا کو لٹکھا کر چپٹ لٹا دیا۔

اس کے بالوں کے نیچے سے خون کی ایک باریک سی لکیر نکل آئی تھی اور خود ڈانکا کا رنگ ناقابل یقین حد تک زرد تھا۔ اب یہ کہنا مشکل تھا کہ اس کا رنگ واقعی ایسا مردہ کا سا ہو گیا تھا یا پھر وہ زرد اور مردہ چاندنی کی وجہ سے اسی معلوم ہو رہی تھی۔ بعض اوقات چاندنی عجیب کھیل کھیل کر نظر کو دھوکہ دے جاتی ہے اور خون کی وہ لکیر۔۔۔ وہ بھی ایک معمولی سی سیاہ لکیر معلوم ہو رہی تھی۔

وہ اس کے اوپر جھکا اس کا نام پکارتا رہا لیکن وہ بیدار نہ ہوئی۔ بیدار ہونا تو دور کی بات ہے اس نے حرکت تک نہ کی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ ڈانکا کے سینے پر رکھ دیا۔ اس کا تنفس چل رہا تھا۔ چارلس کو یقین ہو گیا کہ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ زندہ تھی اور۔۔۔۔۔ اس نے موبہوم سی حرکت بھی کی تھی۔ لیکن چارلس کا سر گھوم رہا تھا جسے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تمام رکھا تھا اور اس کے ہاتھ کانپ رہے

رات کو سیاہ ہونا چاہئے تھا وہ سرخ تھی۔ خون کی طرح سرخ، وہ اندھیرا نہ تھا۔ سیاہی مائل سرخی۔ چارلس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو یہ سرخی پکھل کر مختلف اور شوخ رنگوں کی روشنی میں تبدیل ہو گئی اور اتنی حیرتھی یہ روشنی کہ چارلس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ حقیقت میں بے شمار سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی اور وہ اس کی چھین محسوس کر رہا تھا۔

اور پھر چارلس نے اپنے نیچے کوئی نرم اور نرم سی چیز محسوس کی۔ گھاس نرم نرم گھاس۔ وہ شاید زمین پر پڑا ہوا تھا جہاں گھاس آگ رہی تھی لیکن زمین گول گول گھوم رہی تھی۔ چرخی کی طرح بس گھوم رہی تھی۔ چارلس نے گھومتی ہوئی دنیا پر اپنے آپ کو ٹکا رکھنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ نیچے ٹیک کر آنکھیں کھول دیں اور چند ہیا دینے والی روشنی کے الجھڑے دیکھنے لگا۔

رفتہ رفتہ روشنی کی رنگین دھجیاں مدھم ہو کر فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ کوئی الو اپنی منحوس آواز میں چیخ رہا تھا، ہوا درختوں کے چوں اور ٹہنیوں سے لپٹ کر سسکیاں بھر رہی تھی اور بادل کے ایک ٹکڑے کے کنارے میں سے چاندنی کی شعاعیں پھوٹ کر آسمان پر پھیلنے لگی تھیں۔

وہ بدقت تمام اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس پر اسرار بکھی یا کہیں پتہ نہ تھا جس میں سوار ہو کر وہ اور ڈانکا قصر ڈریکولا سے فرار ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے گھوڑے اسے گھسیٹ کر لئے گئے تھے اور کہیں آگے جا کر وہ یا تو الٹ گئی تھی یا ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

لیکن ڈانکا۔۔۔ ڈانکا کہاں تھی؟

اس سوال کے جواب میں اس کے تصور نے جو تصویر دکھائی وہ بڑی ہی لرزہ خیز

دی تین کیلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ چنانچہ بے حد نزدیک اس کے باوجود بے حد دور راستہ سیدھا اور صاف تھا لیکن اس کے لئے بہت طویل اور مشکل تھا۔

وہ جنگل میں گھس پڑا۔ یہاں وہ ایک حد تک محفوظ تھا۔ اپنی بیوی کا بوجھ سنبھالے وہ بڑی احتیاط سے چل رہا تھا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ اگر کوئی انہیں تلاش کر رہا ہو تو ان آوازوں سے ان کا پتہ معلوم نہ کر لے۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود خشک پتے ان کے قدموں تلے چر مرا رہے تھے اور خشک شنیاں چٹاخوں کی آواز کے ساتھ ٹوٹ رہی تھیں اور یہ چٹائے چارلس کو دھماکے معلوم ہو رہے تھے۔ جھاڑیاں اس کے کوٹ سے لپٹ لپٹ جاتی تھیں اور جب وہ آگے بڑھ جاتا تھا تو وہ اس کا دامن چھوڑ کر دیے دور سے درختوں کے تنوں سے ٹکرا جاتی تھیں۔

چارلس آگے بڑھتا رہا لیکن اس کا ہر قدم یوں اٹھ رہا تھا جیسے وہ چپتی اور گھٹنوں تک گہری کیچ میں چل رہا ہو درختوں کی لٹکتی ہوئی شنیاں اس کے چہرے سے ٹکراتی رہیں۔ اس کی آنکھیں جھپک کر بند ہو جاتیں اور پھر فوراً ہی کوئی شنی چابک کی طرح اس کے رخسار پر پڑتی۔ یہ تو خیر رات کا وقت تھا لیکن دن کے وقت بھی اس جنگل میں چلنا مشکل ہوتا کیونکہ ہر درخت سے بیلیں لپٹ رہی تھیں، مٹی برابر جگہ بھی خالی نہ تھی ہر جگہ مختلف قسم کی خاردار جھاڑیاں آگ رہی تھیں اور درخت یوں ملے کھڑے تھے جیسے سر سے سر جوڑے سرگوشیاں کر رہے ہوں۔

اس کا سانس پھول گیا تھا اور اس کے حلق سے سیٹیوں کی آواز کے ساتھ نکل رہا تھا۔ کئی منٹوں تک وہ ڈانٹا کا نام پڑھتا رہا۔ اسے تسلی دیتا رہا، دعائیں مانگتا رہا اور اس کی امیدیں بندھاتا رہا لیکن ڈانٹا کچھ سن نہ رہی تھی اور یہ وہ خود بھی جانتا تھا چنانچہ یہ الفاظ وہ خود اپنی ڈھارس کے لئے بڑھتا رہا تھا۔ لیکن پھر وہ یہ بھی نہ کر سکا۔ اس کی آواز خود بخود ڈوب گئی اور لفظوں نے دم توڑ دیا۔

تھے۔ اس حالت میں وہ کوئی بھی بات یقین سے کیسے کہہ سکتا تھا؟۔۔۔ خود اس کی حالت غیر ہو رہی تھی پھر وہ کیسے معلوم کر سکتا تھا کہ ڈانٹا زندہ تھی یا۔۔۔؟

بیہوش یا شاید مردہ ڈانٹا کو اس نے اپنے کاپٹے ہوئے ہاتھوں پر اٹھالیا۔ اور آج پہلی دفعہ وہ ڈانٹا کا بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ شادی کی پہلی رات کو وہ ڈانٹا کو اس طرح اٹھا کر جملہ عروسی میں داخل ہوا تھا اور اس وقت اس نے اس کا بوجھ محسوس نہ کیا تھا۔

اس کے پیر من من بھر کے ہو رہے تھے اور وہ ہر قدم بڑی کوششوں کے بعد اٹھا سکتا تھا۔ تاہم وہ ڈانٹا کو اٹھائے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ کسی طرف جا رہا تھا لیکن کوئی آواز اس کے دل میں کہہ رہی تھی کہ چوراہے کے قریب ٹھہرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کی چھٹی حس اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد اس چوراہے سے دور چلا جائے اور اس سے پہلے کہ قعر ڈریکولا کی وہ دو عفریت۔۔۔۔۔ ڈریکولا اور ٹیلن۔۔۔۔۔ ان کے تعاقب میں نکل پڑیں وہ کسی محفوظ جگہ پہنچ جائے۔۔۔۔۔ وہ ڈریکولا کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ اسے شکست نہ دے سکتا تھا۔ چنانچہ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ وہ فرار ہو جائے اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ ڈریکولا اور ٹیلن اسے اور ڈانٹا کو تلاش کرنے میں ناکام رہیں۔

چنانچہ وہ کسی طرف جاتا اس سے کوئی فرق نہ پڑ جائے والا تھا۔ اس کے لئے چاروں سمتیں برابر تھیں کچھ دور آگے بڑھنے کے بعد وہ رک گیا اور سوچنے لگا کہ کسی طرف چلا جائے۔ جوزف یاد ٹھیک رہے گا۔ وہاں کے لوگ تو ہم پرست تھے۔ تاہم وہیں جانا مناسب ہو گا۔ جس راستے سے وہ اس طرف آئے تھے وہ بے حد طویل راستہ تھا اور آبادی بہت دور تھی چنانچہ صرف جوزف یاد کچھ قریب تھا حالانکہ اس حالت میں وہاں تک بھی پہنچنا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ چارلس کو یاد آیا کہ جوزف آباد

اور کوئی آواز اس کے دل میں کہہ رہی تھی کہ اسے اپنی شکست قبول نہیں کرنی ہے۔ اس نے اپنا سر اٹھایا۔ ڈانکا ایک زندہ دیر کی طرح پڑی ہوئی تھی درختوں کے پتوں میں سے چمن چمن کر آتی ہوئی چاندنی کے گول داغ اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ مافوق البشرانہ قوت اور کوشش سے کام لے کر وہ ان کی طرف بیٹھنے لگا۔

وہ ڈانکا کے قریب لیٹ گیا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بدستور زندہ تھا۔ زردی اس کے بشرے پر جیسے منجمد ہو کر رہ گئی تھی اور اس کے ماتھے پر خون بھی جم کر لوتھڑے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مایوسی سے وہ کراہ رہا تھا۔

اس نے اپنی بیوی کے زرد اور خاموش چہرے کو چھونے کے لئے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ ڈانکا تک نہ پہنچا۔ چنانچہ ذرا اور آگے گھسٹ آیا اور اپنے جسم کو ایک کہنی کے سارے ذرا سا اوپر اٹھا کر اپنا ہاتھ ڈانکا کی طرف بڑھایا لیکن اس کا ہاتھ ہوا میں ہی اٹھا رہ گیا۔

ڈانکا کے قریب ایک سایہ کھڑا ہوا تھا۔ وہ نہ تو درخت تھا اور نہ ہی کوئی جھاڑی۔ وہ کوئی انسان تھا۔ چارلس کے دیکھتے ہی اس سائے نے حرکت کی۔ وہ ایک قدم ڈانکا اور چارلس کی طرف بڑھا۔

چارلس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور اس نے اپنے کی دوانہ اور کوشش کی۔ اور فوراً ایک آواز نے جو اس جگل کی طرح گھمبیر تھی۔ "میرے چارلس! میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ تم میرے قہر کے قریب نہ جانا۔"

یہ قادر شینڈور کی آواز تھی۔

اس نے ایک ٹھوکر کھائی، لڑکھڑا کر جھکا، پھر منبھلا، اپنا توازن قائم کیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ چند منٹوں تک اپنا دم درست کرتا رہا اور آگے بڑھا۔ لیکن اب اس کی قوت جواب دینے لگی تھی۔ اس کی ٹانگیں آپس میں ٹکرا رہی تھیں اور پھر وہ بالکل ہی جواب دے گئیں اور وہ اپنی بیوی کو سنبھالے ڈھے گیا۔

زین پر کانٹے تھے، درختوں کی خشک چھال پڑی تھی اور جڑیں ابھری ہوئی تھیں، گرنے یا بیٹھنے کے لئے یہ بڑی تکلیف دہ جگہ تھی۔ لیکن چارلس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ اب اسے کسی چیز کی پروا نہ تھی۔ وہ احساس کی حدود سے پرے پہنچ چکا تھا۔ ڈانکا اس کے ہاتھوں پر سے لڑھک کر دھپ سے نیچے جا پڑی لیکن اس کی بھی چارلس نے پروا نہ کی اور اب پروا کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ اب یہی ان کی آخری منزل تھی۔ اس سے آگے وہ نہ جاسکتا تھا۔ وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اور وہ قہر ڈر کھلا کے عفریت انہیں تلاش کرتے ہوئے شاید اسی طرف آرہے تھے۔

چارلس اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اس کا ایک رخسار سر زمین پر ٹکا ہوا تھا اور زمین کی ٹھنڈک رفتہ رفتہ اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر رہی تھی اور کسی درخت کی ابھری ہوئی جڑ یا شاید کوئی ٹہنی اس کی ہائیں کپٹی میں بیدردی سے چب رہی تھی لیکن اس نے ذرا بھی حرکت نہ کی۔ وہ مختصر رہا کہ زمین ایک بار پھر تیزی سے کھوٹنے لگ جائے، ایک بار پھر رات کا اندھیرا سرفی میں تبدیل ہو جائے اور پھر یہ سرفی اسے نگل لے اور وہ بے ہوش ہو کر اس حتمی، امیدوار، اور خوف سی آزاد ہو جائے۔ لیکن نہیں اس کے پھولے ہوئے سانسوں کی آواز زندگی کی آواز تھی۔ وہ زندہ تھا۔ لیکن تھک چکا تھا۔ وہ اپنی ہار تسلیم کر لیتا چاہتا تھا لیکن خود اس کے حتمی کی آواز اس کی ہمت بندھا رہی تھی۔ زندگی سے لپٹے رہنے کے لئے اسے اکسار ہی تھی

اس نے اٹھ بیٹھے کی کوشش کی اور پھر اپنے ہاتھوں کا زور لگا کر اٹھا۔

”ڈانکا! آ۔ آ۔ آ!“

ایک دروازہ چرچا کر کھلا اور ایک راہب کمرے میں داخل ہوا۔

”شکر ہے مسٹر کینٹ کہ آپ بیدار ہو گئے۔“ راہب نے کہا۔

”میری بیوی۔۔۔“

”فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کی بیوی مزے میں ہیں اور اب تک سوری

ہیں۔ ان کی فحاشت کئی ہفتوں تک قائم رہے گی۔۔۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں وہ اچھی

ہیں۔“

”میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”فی الحال انہیں آرام کرنے کی سخت ضرورت ہے۔“

”میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ چارلس نے ضدی بچے کی طرح کہا۔

”بے شک آپ انہیں دیکھ لیں گے۔“

”کب؟“

”جب وقت آئے گا۔“

چارلس کے ذہن کے کسی گوشے میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ اتنے کم وقت میں

اتنے بہت سے واقعات ہو چکے تھے کہ وہ کسی پر اعتبار نہ کر سکتا تھا۔ کسی کی بھی ممان

نوازی ایک جال ہو سکتی تھی۔ ہر تسکین بخش لفظ اسے دھوکا دینے کے لئے کہا جاسکتا

تھا کہ اسے ہٹا پھٹا کر پھر وہاں لے جایا جائے جہاں سے وہ فرار ہوا تھا۔ وہی تصور جو

ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا تھا اور جہاں کی ایک ایک انچ زمین پر خطرہ تھا۔ ایسا خطرہ جو

اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ کسی پر اعتبار نہ کر سکتا تھا۔ کسی

کی ممان نوازی اور ہمدردی پر بھروسہ نہ کر سکتا تھا۔

چارلس اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس دفعہ دنیا خود اس کے چاروں طرف گردش

کرنے لگی اور وہ خود شرابی کی طرح جھومنے لگا۔ فوراً ایک مضبوط ہاتھ اس کی کمر

آپڑا۔ اس ہاتھ نے اسے سہارا دیا۔ اس کے ہاتھ سے تسکین اور اطمینان کی لہر

پھوٹ کر چارلس کے جسم میں سرایت کر رہی تھیں اور اسے احساس ہوا کہ وہ اب

محفوظ تھا اور ڈانکا بھی محفوظ تھی۔

چنانچہ چارلس نے آخر کار اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب اسے ہوش آیا اور اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو پہلے تو اس کا

سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن چند لمحوں بعد ہی اس نے دیکھا کہ خوف ناک جنگل کی الجھ

ہوئی ٹیلیں اور خاردار جھاڑیاں بے رنگ دیواروں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ کچھ د

نک وہ چت پڑا سوچتا رہا کہ وہ کہاں تھا؟ اوپر درختوں کی آہں میں الجھی ہوئی مٹیاں

نہ تھیں بلکہ سنگین چھت تھی۔

اس نے آہستہ سے کروٹ لی۔ وہ ایک تنگ سے حجرے میں تھا اور گھاس پر نہیں

بلکہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ بستر سخت مگر آرام دہ تھا۔ حجرے کے ایک کونے میں ایک می

اور اس کے سامنے ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میز پر میز پوش نہ تھا اور کرسی پر گد

نہ تھی۔ یہ دونوں چیزیں اپنی سادگی اور ننگے پن کے باوجود باعث تسکین تھیں۔

یہ ایک غیر مانوس سا کمرہ تھا۔ ایسا کمرہ جس کا وہ عادی نہ تھا۔ یہ اس کے گھر

کمرے کی طرح نہ تھا اور نہ ہی کسی ہوٹل کے کمرے جیسا تھا جس میں وہ اور ڈا

اس سفر کے دوران مقیم ہوئے تھے۔ لیکن اس کمرے کی خاموشی اور ٹھنڈک میں کو

خاص بات تھی جو اس کے دل پر عجیب طرح سے اثر انداز ہو رہی تھی باوجود کوشش

کے وہ اس اثر کو سمجھ نہ سکا۔

”ڈانکا!“ اس نے آہستہ سے کہا۔

اس نے پوچھا ”میں کہاں ہوں؟“

”آپ ہماری خانقاہ میں ہیں“ جواب ملا۔

”خانقاہ! کون سی خانقاہ؟“

”کیلن برگ کی خانقاہ۔“

اور اس کے دماغ کا درجہ کھل گیا اور اسے وہ راہب یاد آگیا۔



کیا نام تھا اس کا؟ ہاں شینڈور، قادر شینڈور اور پھر اسے یاد آیا کہ قادر شینڈور نے ان سے کہا تھا کہ وہ بھولے سے بھی قصر کے قریب نہ جائیں۔۔۔۔۔ اور پھر اسے یہ بھی یاد آگیا کہ قصر سے فرار ہونے کے بعد جب وہ جنگل میں تھا، اور ہمت ہار چکا تھا تو قادر شینڈور وہاں آگیا تھا اس کی سرزنش کے الفاظ بھی چارلس کو یاد آگئے۔

”قادر شینڈور۔۔۔۔۔“ اس نے کہا۔

”آپ کپڑے پہن لیجئے۔ پھر میں آپ کو ان کے پاس لے چلوں گا۔ وہ خود آپ سے ملاقات کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔“ وہ دروازے کی طرف گھوم گیا ”آپ تیار ہو جائیں تو مجھے آواز دے لیجیے گا۔“

”آپ کا نام؟“

”مارک۔۔۔۔۔ برادر مارک۔“

چارلس خود قادر شینڈور سے ملنا چاہتا تھا۔ جلد از جلد ملنا چاہتا تھا۔ بہت سے سوالات اس کے دماغ میں سنہریوں کی طرح گلبلا رہے تھے اور وہ ان سوالات کے جواب حاصل کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ چنانچہ وہ کپڑے پہنے لگا لیکن ایسا معلوم ہوا کہ وہ تیزی اور پھرتی کا ثبوت نہ دے سکتا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ بھی ہلا سکتا تھا۔ وہ اس شخص کی طرح محسوس کر رہا تھا جو فالج کے شدید حملے کے بعد ابھی ابھی ہتھ سے اٹھا ہو۔ اس کی حرکت بے حدست تھی جیسے اس کے اعصاب پر حکم رساں

مطالعہ گاہ میں وہ ایک اسکار اور مفکر ظاہر ہو رہا تھا قادر شینڈور کی ایک نہیں بلکہ کئی شخصیتیں تھیں اور مختلف ماحول میں اس کی مختلف شخصیتیں نمایاں ہو جاتی تھیں اور اس کے لئے اسے کوئی زیاض نہ کرنا پڑتا تھا۔ بلکہ یہ ایک قابل رشک عطیہ تھا جو خود قدرت نے اسے عطا کیا تھا۔

حالانکہ اس کا لہجہ نرم اور شائستہ تھا۔ تاہم اس نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔
”مسٹر چارلس! قعر میں جو کچھ ہوا اس کی تفصیلات بیان کرنے کے لئے آپ تیار ہیں۔؟“

قعر میں جو کچھ ہوا تھا اس کی تفصیلات خود چارلس کے دماغ پر ایک بوجھ بنی ہوئی تھیں، اور وہ یہ بوجھ ہر حال اتار پھینکنا چاہتا تھا۔ بے شک وہ تیار تھا۔ وہ پوری داستان سنا دینا چاہتا تھا، تاکہ پھر قادر شینڈور اس سے کوئی نتیجہ اخذ کر کے خود چارلس کو بتا سکے کہ یہ سب کیا تھا۔ تاکہ پھر اندھیرے میں روشنی غالب آجائے اس بھیاںک خواب پریشاں کی تعبیر معلوم ہو سکے۔ اور وہ لرزہ خیز سراپ ہٹ جائے جس کا سایہ چارلس اپنے سر پر محسوس کر رہا تھا۔

چنانچہ چارلس نے اپنی داستان شروع کی۔

اس نے بتایا کہ کسی طرح سرائے سے روانہ ہو کر چوراہے تک پہنچ گئے اور چارلس کو احساس ہوا کہ اس سفر کی ایک ایک تفصیل اس کے دماغ پر نقش تھی وہ کوئی معمولی سی بات بھی نہ بھول رہا تھا، خود چارلس کے لئے یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی، کہ جیسے جیسے وہ بیان کر رہا تھا۔ اس بیت ناک داستان کی حمیں خود بخود کھلتی جاری تھیں اور پچھلے تمام واقعات از سرنو اس کی نظر کے سامنے وقوع پذیر ہوتے جا رہے تھے، ایک بار پھر وہ انہی واقعات سے گزر رہا تھا اور انہی ناقابل فہم خطرات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ اپنی داستان سنا کر خاموش ہوا۔ تو خزاں رسیدہ

کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ یا ان میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے دماغ اور اعصاب کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ ہر حال وہ کپڑے پہننے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اب وہ محسوس محسوس کر رہا تھا۔ اور اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ بستر پر چڑ گیا۔ اور کئی منٹوں تک بیٹھا رہا۔

”برادر مارک“ آخر کار اس نے آواز دی۔ اس کی آواز کھوکھلی تھی اور زیادہ بلند نہ تھی۔

فوراً دروازہ کھول کر برادر مارک اندر آ گیا۔

اور وہ برادر مارک کے پیچھے چل پڑا۔ اور اس نے چارلس کو قادر شینڈور کی مطالعہ گاہ میں پہنچا دیا۔

یہ کمرہ اس کمرے سے نسبتاً بڑا تھا جس میں سے چارلس نکل کر آیا تھا اس کمرے میں بھی ویسی سادگی تھی جو اس کمرے میں تھی جس میں چارلس کو ہوش آیا تھا۔ البتہ اس کمرے میں الماریوں کی ایک قطار تھی اور ان الماریوں میں موٹی موٹی اور مراکشی چمڑے کی جلد والی خوبصورت کتابیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔

قادر شینڈور اس کے استقبال کو اٹھ کھڑا ہوا اور چارلس نے دیکھا کہ اس کے بشرے سے وہ بٹاشٹ عیاں نہ تھی جو چارلس کو ان کی پہلی ملاقات کے وقت نظر آئی تھی۔ قادر شینڈور کے بشرے سے اس وقت سنجیدگی عیاں تھی اور وہ خود بے حد گھمبیر نظر آ رہا تھا۔ اور چارلس کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ راہب قابل رشک اور مافوق طبعیت کا مالک ہے چنانچہ وقت اور ماحول کے مطابق اپنی طبعیت اور جذبات کو تبدیل کر لیتا ہے۔ چونکہ اس وقت وہ کسی سرائے میں نہیں بلکہ خانقاہ میں تھا اور یہاں کا ماحول سنجیدہ اور خاموش تھا۔ چنانچہ خود شینڈور بھی سنجیدہ اور گھمبیر بن گیا تھا۔ اس ماحول سے باہر وہ لوگوں سے ہنس بول سکتا تھا۔ فقرے چست کر سکتا تھا لیکن یہاں اپنی

بچے کی طرح کانپ رہا تھا۔

”تو یہ بات ہے۔“ قادر شینڈور نے سر ہلا کر کہا، وہ پھر زندہ ہو گیا۔

”پھر زندہ ہو گیا! کون؟“

”میں یہاں کے راہبوں سے اور اندوگرد کے بہتی والوں سے اور دور دور تک کے لوگوں سے کہا کرتا تھا۔ کہ اس عفریت کا جو زمانہ ختم ہوا تھا، وہ پھر واپس آ گیا ہے۔ ایک بار پھر اس کی خوفناک حکومت کا آغاز ہو گا۔“

”بچے غائب ہونے لگیں گے۔ لڑکیوں کی شہ رگ پر دو سوراخ نظر آئیں گے وہ سفید ہوتی چلی جائیں گی اور پھر مرجائیں گی لیکن مرنے کے بعد بھی انہیں سکون نصیب نہ ہو گا۔ کیونکہ مرنے کے بعد وہ ذاتوں کو اپنی قبروں سے نکل آئیں گی اور شکار کی تلاش میں بھٹکتی پھریں گی۔ پھر وہ واپس آ گیا ہے۔ وہ زندہ ہو گیا ہے۔“

”کون؟ کس کے متعلق کہہ رہے ہیں آپ؟“

”مسٹر چارلس! آپ اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ اس کے باوجود مجھ

سے پوچھ رہے ہیں۔؟“

”کونٹ ڈریکولا! لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”وہ تو مر چکا تھا۔؟“

”بے شک۔ لیکن اب وہ زندہ ہے۔“

”کیسے یقین۔۔۔“

”خود آپ اسے دیکھ چکے ہیں۔ وہاں قبر ڈریکولا میں آپ اس سے ہاتھ پائی کر چکے

ہیں۔“

”لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔؟“

”مسٹر چارلس آپ نہیں جانتے کہ کہاں آگئے ہیں۔“

”کہاں آگیا ہوں؟“ چارلس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ یا تو وہ پاگل ہو گیا ہے یا پھر ساری دنیا پاگل ہو گئی ہے۔

”ویمپائروں کی سرزمین میں۔“

”ہائیں!۔“ چارلس چکر اگیا۔

اور خود آپ کے بھائی نے اسے حیات نو بخشی ہے۔ جو دنیا کے تمام ویمپائروں کا آقا ہے جو سب سے زیادہ خطرناک ہے۔“

”میرے بھائی نے! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”مسٹر چارلس! آپ کے بھائی اس لئے مارے گئے کہ کونٹ ڈریکولا زندہ ہو جائے

اور وہ زندہ ہو گیا دنیا کا سب سے زیادہ لعنتی اور سب سے زیادہ خطرناک ویمپائر۔“

چارلس حیران تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ قادر شینڈور جو کچھ کہہ رہا ہے وہ حقیقت تو نہیں ہو سکتی، یہ راہب شاید مذاق کر رہا تھا۔

چارلس نے ویمپائروں کے متعلق بہت کچھ پڑھا تھا۔ خوبصورت جلد والی کتابوں میں پڑھا تھا۔ اپنے وطن لندن اور اپنے آراستہ اور روشن کمرے میں آرام وہ کرسی

میں بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ اسے یہ کتابیں بڑی دلچسپ معلوم ہوئی تھیں سادہ لوح

دہشتاتیوں اور کاشت کاروں کی اس توہم پرستی پر وہ مسکرایا کرتا تھا۔

”یقین نہیں آ رہا مسٹر چارلس؟“ قادر شینڈور نے اس کی دلی کیفیت معلوم کر کے

کہا۔ ”کونٹ ڈریکولا“ آپ کے وطن میں لندن آچکا ہے ثبوت چاہتے ہو؟ اور قادر

شینڈور نے ایک فائل میں سے کسی اخبار کا تراشہ نکال کر دکھا۔ اور پھر آہستہ سے

اس کی طرف بڑھا دیا۔“

”پڑھو اسے۔“

یہ اخبار ”ڈیلی گراف“ کا تراشہ تھا۔ چارلس پڑھنے لگا۔

وقت تک نگر نہ اٹھائیں گے جب تک کہ طوفان گزر نہیں جاتا۔ شام ہوتے ہوتے ہوا بند ہو گئی۔ آدمی رات ہوئی تو ہوا نام کو نہ تھی۔ اور فضاء میں ایسی خاموشی تھی جو عموماً طوفان سے پہلے ہوتی ہے ایسی خاموشی اور اعصاب پر سوار ہو جانے والی رات کا تجربہ دھبٹی کے باشندوں کو پہلے کسی نہ ہوا تھا۔ فضاء میں اتنا گھجس تھا کہ لوگوں کے دم گھٹ رہے تھے۔ سمندر سنسان تھا۔ مای گھو اپنی کشتیاں ساحل پر لے آئے تھے۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے جہاز بھی جو ساحلوں کے قریب چکر لگایا کرتے ہیں محفوظ مقامات پر پہنچا دیئے گئے تھے۔ سمندر ویران تھا۔ البتہ ایک بدیسی جہاز دور نظر آ رہا تھا۔ اس جہاز کے سب ہی بادبان کھلے تھے اور وہ مغرب کی طرف جاتا معلوم ہوتا تھا۔ اس جہاز کے کپتانوں کی لاعلمی اور حماقت بحث کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ بندرگاہ کے محافظوں نے جھنڈیوں کی زبان میں اس بدیسی جہاز کے کپتان کو متوقع خطرے سے آگاہ کرنے کے کی کوشش کی لیکن کچھ نہ ہوا۔ جہاز کے تمام بادبان بدستور کھلے تھے رات کا اندھیرا اترنے سے پہلے تک وہ جہاز اپنے کھلے ہوئے بادبانوں سمیت دیکھا گیا۔ وہ یوں ڈول رہا تھا جیسے اس کا کوئی مالک ہی نہ ہو۔ جیسے وہ بے سارا ہو۔

دس بجنے سے کچھ پہلے ہوا بالکل بند ہو گئی اور فضاء اتنی خاموش تھی کہ چراگاہ میں مسماتی ہوئی بھیڑوں اور دور گھائی میں بھونکتے ہوئے کتوں کی آوازیں قصبے کے آخری سرے تک سنی گئیں۔ آدمی رات کا گمراہی ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ سمندر کی دسعتوں میں سے گزر گراہٹ کی عجیب سی آواز سنائی دی۔ جس کی گونج خاموش فضاء میں بہت دیر تک حیرتی رہی۔

اور پھر حیرت انگیز سرعت سے، جو قطعی ناقابل یقین اور بعد میں غور کرنے سے ناممکن معلوم ہوئی۔ طوفان پھٹ پڑا، فضاء کا سکون درہم برہم ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سمندر میں کوہ پیکر موجیں اٹھنے لگیں۔ طوفان کا زور دم بدم بڑھتا ہی چلا گیا اور سمندر

ہمارے نامہ نگار کے قلم سے

۱۸ اگست:

دھبٹی۔

ایک زبردست اور ناگمانی طوفان جیسا کہ پچھلے سو سال سے نہیں دیکھا گیا، آج یہاں پھٹ پڑا، اور اس طوفان کے جو نتائج ظاہر ہوئے وہ نوعیت کے اعتبار سے انوکھے اور حیرت انگیز تھے موسم گرم تھا اور فضاء میں گھس ماہ اگست میں عموماً ہوتا ہی ہے۔ ہفتے کی شام بے حد خوشگوار تھی۔ چنانچہ بہت سے شوقین مزاج لوگ اتوار گزارنے کے لئے دھبٹی کے قریبی جزائر میں گئے تھے۔ ”ایما“ اور ”اسکراپو“ نامی چھوٹے جہازوں نے ان تفریح کرنے والوں کو جزائر تک پہنچانے کے لئے دھبٹی سے جزائر تک کئی پھیرے کئے۔ دن، دوپہر ڈھلنے تک بے حد خوشگوار اور روشن رہا چند بے فکرے، جو اپنی شامیں دھبٹی کے قبرستان میں گزارتے ہیں وہاں گئے وہ پرسکون سمندر کا نظارہ کر رہے تھے کہ ان میں سے ایک کی نظر اچانک کسی انجانے جہاز پر پڑی جو بہت دور تھا۔ اور جیسے یکایک ہی جنوب مغربی افق سے نمودار ہو گیا تھا۔ اس وقت شمالی مشرق کی طرف سے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے۔ بحری پولیس کا ایک آدمی فوراً اس پہاڑی پر پہنچ گیا جس پر قبرستان ہے اور اس نے دور بین کے ذریعے دور نظر آتے ہوئے جہاز کا معائنہ کیا اور پھر بندرگاہ کے افسروں کو اطلاع دی۔ ایک بوڑھے مای گھو نے، جو اسی قبرستان میں بیٹھا کرتا ہے، زبردست طوفان کی پیشین گوئی کی سورج غروب ہونے کا منظر اتنا مسرور کن تھا کہ اسے دیکھنے کے لئے دھبٹی کی نصف آبادی قبرستان والی پہاڑی پر جا پڑی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ غروب آفتاب کا ایسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ناگمانی اور زبردست طوفان کی اتواہ اب عام تھی۔ چنانچہ ان کپتانوں نے جن کے جہاز دھبٹی کی بندرگاہ میں نگر انداز تھے۔ فیصلہ کیا کہ وہ اس

تک استعمال نہیں کی گئی تھی۔ لیکن آج اس کی قوت آزمانے کا وقت آیا تھا چنانچہ چند ٹائیوں بعد ہی روشنی کی موٹی لکیر اندھیرے اور امواج سمندر کے سینے پر دوڑ گئی۔ ایک دو دفعہ اس سرچ لائٹ نے بڑا کام بنایا۔ پھیلیاں پکڑنے کی ایک کشتی جو اندھیرے میں ٹانگ ٹوٹیاں مار رہی تھی، اس کی روشنی میں صحیح سلامت بندرگاہ تک پہنچ گئی۔ ورنہ وہ جنوبی چٹان سے ٹکرانے والی تھی جب بھی کوئی کشتی ساحل یا بندرگاہ پر پہنچتی وہاں کھڑے ہوئے وہ لوگ تھے جن کا دنیا میں کوئی نہ تھا اور جن کی استقبال کرتے اور وہاں کھڑے ہوئے وہ لوگ تھے جن کا دنیا میں کوئی نہ تھا اور جن کی بے فکری ضرب المثل تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی سرچ لائٹ کی روشنی میں ایک جہاز نظر آیا جس کے سارے بادیان کھلے تھے اور جو طوفان میں تنکے کی طرح ڈول رہا تھا یہ وہی بلسی جہاز تھا جو شام کو بہت دور دیکھا گیا تھا۔ ہوا میں اور زیادہ تیزی آگئی تھی اور ساحل پر کھڑے ہوئے لوگ اس جہاز کے انجام کے خیال سے کانپ اٹھے تھے۔ بیشک وہ جہاز خطرے میں تھا۔ بندرگاہ اور جہاز کے درمیان وہ زیر آب چٹانیں تھیں جن سے ٹکرا کر کئی جہاز غرق ہو چکے تھے۔ موجوں کی کوہ پیکری میں کی واقع نہ ہوئی تھی اور وہ جہاز اس تیزی سے ڈول اور بہہ رہا تھا کہ بقول ایک ملاح ”اب وہ سمندر کی تہ میں ہی ٹکرانے والا ہوگا“..... دفعتاً بہت سا جھاگ فضا میں بکھر گیا اور ساتھ ہی غم آلود کمرے ساحل پر کھڑے ہوئے لوگوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اتنا گاڑھا تھا کہ کمرے ٹھوس معلوم ہوتا تھا۔ اس کمرے ساحل پر کھڑے ہوئے لوگوں کو عارضی طور پر اندھا کر دیا تھا البتہ ان کی قوت سامعہ قائم تھی اور وہ کڑک اور گرج کی آوازیں، جن کی شدت پچھلی تمام آوازوں سے بڑھ کر تھی سن رہے تھے۔ سرچ لائٹ کا رخ مشرقی چٹان کی طرف پھیر دیا گیا تھا اور اس طرف روشنی ڈالی جا رہی تھی جس طرف کہ اس

کی ہر موج پہلی موج سے زیادہ تباہ کن اور بھیاںک ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ سمندر سے کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا شور بلند ہوا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ لوگ کھمبول وغیرہ سے لپٹ گئے کہ اڑ نہ جائیں۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ ہوا میں سیٹی کے بجائے گڑگڑاہٹ کی آواز تھی۔ جو لوگ قبرستان والی پہاڑی اور بلند مقامات پر کھڑے ہوئے تھے انہیں وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ ایک طوفان ہی کیا کم تھا کہ دفعتاً ”سمندر سے گاڑھا گاڑھا کراٹھ کراٹھ کر ساحل پر پھیلنے لگا۔ کمر مرطوب تھا۔ اس قدر مرطوب کہ لوگوں کو یہ وہم ہو گیا کہ یہ کمر دراصل ان لوگوں کی روحیں ہیں جو سمندر میں غرق ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ لوگ جو اب تک ساحل سمندر اور بندرگاہ پر کھڑے تھے بدحواس ہو کر اپنے گھروں کی طرف بھاگے۔ ہمارا نامہ نگار کہتا ہے کہ فضا میں کوئی خاص بات تھی جس نے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے فضا میں موت رچی ہوئی تھی۔ اور ناقابل فہم کمر گویا موت کا فرشتہ سرد اور بھیاںک کمر کی چادر میں دقا ”دقا“ شکاف پڑ جاتے اور آسمان پر کوندتی ہوئی بجلی میں سمندر مہیب دیو کی طرح نظر آتا۔ آسمان پر بار بار بجلی کوند رہی تھی اور کڑک اور گرج کی آوازیں لوگوں کے دل ہلا رہی تھیں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ساتوں آسمان آپس میں ٹکرا رہے ہیں لوگ اپنے گھروں میں سے بیٹھے تھے اور بوڑھے کہہ رہے تھے کہ یہ قہر الہی ہے جو دمبٹی پر نازل ہوا ہے۔ کمر کی چادر میں شکاف پڑنے اور بجلی کے چمکنے سے جو منظر دیکھنے کو ملتا تھا وہ بے حد دلچسپ تھا۔ سمندر کی ہر کوہ پیکر موج سفید سفید جھاگ کو حیرت انگیز اونچائی تک اچھال دیتی تھی۔ اور اس جھاگ کو تیز پھینکتی ہوئی ہوا فضا میں یوں بکھیر دیتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا جیسے آتش بازی کے ٹھنڈے اتار چھوڑ دیئے گئے ہوں، آبی پرندے، جو گھبرا کر اپنی پناہ گاہوں سے نکل آئے تھے۔ تیز پھینکتی ہوئی ہوا میں بے بسی سے قلابازیاں کھارہے تھے۔ مشرقی چٹان کی چوٹی پر جو نئی سرچ لائٹ لگائی گئی ہے وہ آج

اندھرا اتر آیا تھا اس وقت کہ سرچ لائٹ کی خیرہ کن روشنی بھی کچھ کام نہ دے رہی تھی۔

چارلس نے خاموشی سے ڈیلی گراف کا یہ تراشہ فادر شینڈور کی طرف بڑھادیا۔
 ”تو اس رات مسٹر چارلس“ فادر شینڈور نے تراشہ فائل میں رکھتے ہوئے کہا
 ”کونٹ ڈریکولا د مہٹی کے ساحل پر اتر ا تھا“

”لیکن اس تراشے میں کونٹ ڈریکولا یا کسی بھی مسافر کا ذکر تو ہے نہیں“ چارلس
 نے حیرت سے کہا۔

”ایک جگادری اور خونخوار کالے کتے کا ذکر تو ہے نا؟“
 ”ہاں ہے“

”بس تو وہی کالا کتا کونٹ ڈریکولا تھا اور عناصر کا وہ کٹڑا اسی نے پیدا کیا تھا کہ کوئی
 اسے ساحل پر اترتے نہ دیکھ سکے اور اس کا تعاقب نہ کرے۔
 ”کیا کہا آپ نے فادر کہ وہ کتا ڈریکولا تھا“
 ”بالکل“

”تو پھر معلوم ہوا کہ وہ اپنا روپ بدل سکتا ہے۔“

”بے شک۔ وہ جو چاہے بن سکتا ہے۔ خصوصاً چگادری اور بھیڑیا“

”اگر ایسا ہی ہے تو پھر جب ہم قعر میں سے فرار ہوئے ہیں تو اس وقت بھی وہ
 چگادریا بھیڑیا بن کر ہمارا تعاقب کر سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔“ چارلس نے بے یقینی
 سے کہا۔

”ہاں لیکن ابھی وہ لس دور جے تک نہیں پہنچا ہے بات یہ ہے کہ وہ دس سال کے
 بعد زندہ ہوا ہے۔ آپ کے بھائی کے خون نے اسے زندہ کیا ہے اور آپ کی بھابی کا
 خون چوس کر اس نے اپنی دس برس کی پیاس بجھائی ہے لیکن اب بھی وہ کمزور ہے

بدلی جہاز کے چٹانوں سے ٹکرانے کا خدشہ تھا۔ لوگ دم سادھے اس جہاز کے انجام
 کے فتنہ تھے یکایک ہوا کا رخ بدل گیا، جھاگ بیٹھ گیا اور پھر ایک معجزہ ہوا۔۔۔ دونوں
 چٹانوں کے درمیان یکایک وہ جہاز نمودار ہوا جس کی بنیادی خیال سے لوگ کانپ
 رہے تھے۔ اب بھی اس کے بادبان کھلے تھے اور اب اس کی رفتار خطرناک حد تک تیز
 تھی۔ سرچ لائٹ جہاز کے ساتھ ساتھ گھومتی رہی اور جب وہ جہاز قریب آیا تو سرچ
 لائٹ کی روشنی میں لوگوں نے ایسا منظر دیکھا کہ بعض کی چیخیں نکل گئیں۔ چوار کے
 ڈنڈے سے ایک ملاح کی لاش بندھی ہوئی تھی جس کا آگے کی طرف ڈھلکا ہوا سر
 ایک بھیانک انداز میں دائیں بائیں ڈول رہا تھا۔ غرے پر اس لاش کے علاوہ کوئی اور
 نظر نہ آ رہا تھا۔ یہ واقعی ایک حیرت انگیز بات تھی بلکہ معجزہ تھا کہ وہ جہاز اپنے آپ ہی
 صحیح سلامت بندرگاہ تک آگیا تھا جہاز بندرگاہ میں رکنے کے بجائے آگے بڑھ گیا اور
 ساحل پر پڑے ہوئے ریت اور نکلر کے اس انبار پر جا چڑھا جو سمندر کے مد جزر سے
 اس پہاڑی کے قدموں میں جمع ہو گیا تھا۔ جس پر قبرستان واقع ہے۔ اور جسے ہمارے
 قصبے کے لوگ نیٹل کہتے ہیں۔

جب وہ جہاز ریت اور نکلر کے انبار پر چڑھا تو ایک زبردست دھماکہ ہوا بادبانوں
 کے مستول چڑچڑا کر گرے اور رے ٹوٹ گئے اور ہلیاں زبردست آواز کے ساتھ
 غرے پر گریں اور ساتھ ہی ایک حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ جیسے ہی جہاز ساحل پر
 چڑھا یکایک ایک کالے رنگ کا جگادری اور خونخوار کتا جہاز کے کسی ٹپلے کمرے میں
 سے یوں اچھل کر غرے پر آیا جیسے اسے توپ میں بھر کر چھوڑا گیا ہو۔ وہ حیرت انگیز
 پھرتی سے ساحل پر کودا اور بے تحاشہ اس پہاڑی کی طرف بھاگا جس پر قبرستان اور
 پرانا گرجا واقع ہے۔ اس طرف سے پہاڑی اتنی عمودی ہے کہ اس پر کوئی جانور حتیٰ کہ
 پہاڑی بکرا بھی نہیں چڑھ سکتا۔ وہ کالا کتا جلد ہی اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اور ایسا

ہر ڈیکولا نے ایک بار پھر اپنی قوتیں حاصل کر لیں تو یہ تمام ڈائنیں ایک بار پھر آزاد ہوں گی۔ ڈیکولا کا اثر دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور وہ کئی صدیوں سے زندہ تھا کئی دفعہ ہم نے یقین کر لیا کہ وہ مردہ ہو گیا لیکن تبھی وہ زندہ ہو کر واپس آیا۔ اور ہر دفعہ اس نے اپنا اثر دور دور تک پھیلا کر گویا اپنی لختی حکومت قائم کر لی۔

شینڈور خاموش ہو کر ڈائری کے ایک صفحہ پر جھک گیا اور چند ثانوں کے وقف کے بعد بولا۔

دس برس پہلے ہم نے یقین کر لیا تھا کہ ڈیکولا کا خاتمہ ہو گیا لوگوں نے مذہبی رہنماؤں نے اور حکومت نے بڑی کوششوں سے تلاش کر کے ایک ایک ڈائن اور ڈیکولا کے ایک ایک ساتھی کا خاتمہ کر دیا تھا اور ہم نے اطمینان کا سانس لیا تھا یہاں تک کہ صرف ڈیکولا باقی رہ گیا تھا۔۔۔۔۔ دس برس پہلے چند جیالے انگریزوں نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا لیکن۔۔۔۔۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ آخری رسوم اوانہ کی گئی تھی شاید اس کے سینے میں کھوٹا ٹھونکا گیا۔ چنانچہ وہ لوگوں کی نظر کے سامنے مرنے لگا لیکن اس کا خاتمہ نہ ہوا اور وہ انتظار کرتا رہا۔۔۔۔۔ ان شرائط کے پورا ہونے کا انتظار کرتا رہا جو ایک بار پھر اسے زندہ کر دیں گی اور تمہارے بد قسمت بھائی تھے جنہوں نے یہ شرائط پوری کر دیں اور آخر کار یہ مردہ جس کا نام کونٹ ڈیکولا ہے، ایک بار پھر اپنی قبر میں سے نکل آیا۔“

شینڈور نے جو کچھ کہا تھا اس کی حقیقت اس کی آنکھوں سے عیاں تھی چنانچہ ہارلس اس سے نظر نہ ملا سکا تھا۔ فادر شینڈور نے جو کچھ کہا تھا وہ یقیناً جھوٹ نہ تھا۔ ہارلس شینڈور کے پیچھے الماری میں رکھی ہوئی کتابوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان کتابوں میں اس عذاب کی پوری داستان محفوظ تھی جو صدیوں سے اس علاقے پر ڈیکولا اور اس کی ”دہنوں“ کی شکل میں نازل ہوا تھا۔

چنانچہ جب تک وہ مزید لڑکیوں یا مردوں یا بچوں کا خون نہیں پی لیتا اس کے روپ بدلنے کی قوت عود نہیں کر سکتی۔“

چارلس کانپ گیا۔

”میری بھابی۔۔۔۔۔“ اس نے کہا۔

”آپ کی بھابی اب اس عفریت کی دہن بن چکی ہیں۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ کی بھابی بھی اب ڈائن ہیں۔ ڈیکولا جس لڑکی کا خون پیتا ہے وہ ڈائن بن جاتی ہے۔“

”میرے خدا!“ چارلس نے مردہ آواز میں کہا۔ ان باتوں کو میں وہی دماغ کی اچھ سمجھے ہوئے تھا۔“

فادر شینڈور نے گھوم کر اور ہاتھ برسا کر اپنے پیچھے والی الماری میں سے ایک مجلد کتاب کھینٹ لی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ چارلس نے دیکھا کہ یہ کوئی چھپی ہوئی کتاب نہ تھی بلکہ نہایت صاف خط میں لکھی ہوئی ایک ڈائری تھی۔

”کاش کہ یہ باتیں وہی دماغ کی اچھ بنی ہوئی“ شینڈور نے کہا۔

”لیکن یہاں کا ہتھما میں ہم ویسپائز کو دیو مالا کی کہانی اور توہم پرستی کہہ کر اس سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ مسٹر چارلس ہمارے زمانے کے ماضی قریب میں یہ عفریت، جو آپ کو دیو مالا کا ایک کردار معلوم ہوتا ہے ایک ٹھوس حقیقت تھا لیکن ہمیں امید تھی کہ آئندہ ہمارے یہاں ویسپائز نہ ہوں گے اس لختی طریق کے سوتے خود ڈیکولا سے پھوٹے ہیں۔ خود اس کی شیطانی کارستانیوں کی وجہ سے کئی بے گناہ شیر خوار بچے غائب ہوئے اور کئی معصوم لڑکیاں ڈائنیں بنیں۔ آپ نے جنگل میں نیلے نیلے شیلے دیکھے ہوں گے۔ یہ ڈائنیں تھیں لیکن ڈیکولا کے بعد ان کا زور ختم ہو گیا۔“

اور چارلس نے دانت چس کر کہا۔

”میرا بھائی مرچکا اور اس کی بیوی ڈائن بن گئی چنانچہ ڈریکولا کو قتل کرنا اب میرا فرض ہو جاتا ہے۔“

”مسٹر چارلس! آپ ڈریکولا کو قتل نہیں کر سکتے۔“

”قتل نہیں کر سکتا! کیوں؟“

”اس لئے کہ وہ مردہ ہی ہے۔ زندہ مردہ“

”تو پھر۔۔۔“

”اے قتل نہیں کیا جاسکتا البتہ اسے قتل کیا جاسکتا ہے“ تلف کیا جاسکتا ہے۔ میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ دس برس پہلے چند جیلے انگریزوں نے ڈریکولا کو قتل کر دیا تھا۔ لیکن اس کا خاتمہ نہ کیا تھا تو اس سے میری مراد یہی تھی کہ اسے تلف نہ کیا گیا تھا۔“

”تو اسے تلف کسی طرح کیا جاسکتا ہے؟“

”مختلف طریقے ہیں۔“

”مثلاً؟“

”پہلے تو یہ سمجھ لو کہ ڈریکولا رات کے وقت ہی شکار کی تلاش میں نکلتا ہے اور دن کے وقت وہ اپنی قبر یا تابوت میں لیٹا رہتا ہے اور اس وقت وہ مجبور اور بے بس ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ دن کے وقت اس کا بھٹ اور قبر تلاش کر لیا جائے اور پھر اس کے یعنی ڈریکولا کے سینے میں اس طرح کھونٹا ٹھونک دیا جائے کہ وہ اس کے دل کے آپار ہو جائے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے سورج کی شعاعوں کے سامنے براہ راست ڈال دیا جائے اس کے علاوہ بتا پانی اسے غرق کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ بہت قریب ہو جائے تو صلیب اسے جلا کر خاکیر کر سکتی ہے۔ لیکن وہ کبھی صلیب

کے قریب نہ آئے گا۔ مطلب یہ کہ ڈریکولا فانی نہیں ہے۔“

”یہ تو بڑے آسان طریقے ہیں۔“

”جی نہیں۔ بلی کی کھال اور حرنی ہو تو پہلے اسے پکڑنا پڑتا ہے، چکاؤر کے بازو اس وقت نوچے جاسکتے ہیں جب وہ آپ کے ہاتھوں میں ہو۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”مسٹر چارلس! میرے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا کہ بادی لائفل میں معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس یہ کام نہ صرف بہت مشکل بلکہ بے حد خطرناک بھی ہے۔“

”خطرناک کیسے ہے؟“

”ایسے کہ چند دوسرے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کی مدد کریں گے۔“

”یعنی دوسرے دیہات؟“

”جی نہیں بلکہ ہماری آپ کی طرح عام انسان جو کسی ایسے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو

تقریباً ڈریکولا میں مختلف خدمات انجام دیتے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ہیں جو دیہات نہیں ہیں لیکن کسی خاص وجہ سے۔۔۔ اور یہ وجہ اب تک سمجھ میں نہیں آسکی۔۔۔“

”وہ ڈریکولا کے فرماں بردار اور اس کے زیر اثر ہیں۔ جیسے ڈریکولا کا ملازم۔۔۔“

”کیوں؟“

”ہاں وہ بھی۔ انہیں لوگوں میں سے ایک ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے یہ آخری دن برس تقریباً ڈریکولا میں اسی موقع اور وقت کے انتظار میں گزارے ہوں گے جو آپ

نے گزشتہ رات میا کر دیا۔۔۔۔۔ یعنی اپنے آقا کو دوسری زندگی بخشے کا موقع۔

”لیکن اب کیا ہوگا جب کہ اسے دوسری زندگی بخشی جا چکی ہے؟“

فادر شینڈور نے کتاب بند کر کے اس پر یوں سر جھکا دیا جیسے وہ کتاب مقدس ہو۔

”یہ تو ہم نہیں جانتے کہ اب کیا ہوگا۔ اگر جانتے ہوتے تو۔۔۔“

”تو کیا ہوتا؟۔۔۔“ چارلس نے بے تابی سے پوچھا۔

”تو ہم کم سے کم یہ معلوم کر سکتے کہ اب کون سا قدم اٹھایا جائے ہمیں کوشش

کرنی چاہیے کہ یہ دیا اس علاقے میں نہ پھیلنے پائے۔ ڈریکولا زندہ ہو چکا ہے اور اگر

جلد ہی اس کا خاتمہ نہ کر دیا گیا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ اگر اس نے

اپنے مافوق الفطرت قوتیں حاصل کر لی ہیں، اگر اسے زیادہ سے زیادہ خون مل گیا۔ تو پھر

ویہ پائر پیدا ہوں گے اس کی وجہ سے عورتیں ڈائیس بنیں گی اور پھر ہمارے بنائے ہوئے

نہ بنے گا۔

”مسٹر چارلس!“ فادر شینڈور نے بڑی سنجیدگی سے اضافہ کیا ”ویہ پائر حیرت

انگیزی اور تیزی سے بڑھتے اور پھیلتے ہیں۔ انسانوں کے مقابلہ میں سنگی اور جانوروں

کے مقابلے میں دگنی تیزی سے ان کی نسل میں اضافہ ہوتا ہے۔

اور چارلس کو کونٹ ڈریکولا کی شدید پیاس کا بلکہ خون کے ہو کے کا خیال آیا۔

اور ایک بار پھر تصور کی نظر سے اس نے اپنے بھائی کی لاش دیکھی جو وہاں قصر ڈریکولا

کے تہ خانے میں ایک صندوق میں ٹھونس ہوئی تھی، سرکئی اور فچڑی ہوئے لاش اس

کے بھائی کے خون نے اس عفریت کو زندگی بخشی تھی اور پھر وہ میلن کا خون پی چکا تھا

اور میلن ڈائن بن چکی تھی۔۔۔۔۔ چارلس کانپ گیا۔۔۔۔۔ میرے خدا! خود وہ اور ڈائن اس

جہاں کے کسی قدر قریب تھے جو موت نہ تھی۔۔۔۔۔ جو زندگی بھی نہ تھی۔۔۔۔۔ اگر ڈریکولا

نے اس کا اور میلن نے ڈائن کا خون پی لیا ہوتا تو وہ ڈریکولا کی طرح ایک لعنتی ویہ پائر

اور ڈائن میلن کی طرح ایک ڈائن بن جاتی اور پھر وہ خود دوسروں کا خون پیتا اور ڈائن

بچوں کو چراتی کہ ان کے خون سے اپنی پیاس بجھائے اور خدا جانے کب تک۔۔۔۔۔

شاید قیامت تک یا اس وقت جب تک کوئی ان دونوں کو قانا نہ کر دیتا۔۔۔۔۔ ان کی یہ

زندگی جو قطعی زندگی نہ تھی قائم رہتی۔

چارلس کے ماتھے سے ٹھنڈا پسینہ ٹپکنے لگا۔

”میں۔۔۔ میں۔ اپنی بیوی سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ہاں، ہاں۔“ فادر شینڈور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں چاہتا تھا کہ ہم آپ تفصیل سے

مشکو کر لیں اور اس عرصہ میں آپ کی بیوی کو مزید آرام کرنے کا موقع مل جائے۔“

”لیکن میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ شکر اور پریشان ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ

سب ٹھیک ٹھاک نہیں ہے۔ چنانچہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے کہ آپ کی بیوی

زندہ ہیں اور فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔“

چنانچہ وہ دونوں مطالعہ گاہ میں سے نکل کر محرابی غلام گردش میں چل پڑے۔ یہ

گزر گاہ خاموش اور دیران سی تھی اور چارلس کے دل پر اویسی اور افسردگی چھاتی

باری تھی، لیکن ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک راہب نے مسکرا کر چارلس

کی طرف دیکھا، تو اس کی دھارس بندھی یہ اس شخص کی مسکراہٹ تھی، جو بنی نوع

انسان سے محبت کرتا تھا، اور تمام تر ہمدردیاں ان پر نچھاور کر دیتا تھا۔ اور اس کے

نوح کوئی چیز نہ طلب کرتا تھا اور چارلس نے محسوس کیا کہ یہ خائفانہ ایک محفوظ قلعہ

تھا اس منحوس قصر سے زیادہ محفوظ جو ایک پہاڑی پر کھڑا ہوا تھا اور جو قصر ڈریکولا کے

نام سے مشہور تھا۔

فادر شینڈور نے ایک حجرے کا دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کر چارلس کو

اشارے سے اندر جانے کہ کہا۔

ڈانٹا ایک معمولی چارپائی پر ایک کھردرا کھل اوڑھے لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اس کے ماتھے پر خون دھو کر صاف کر دیا تھا لیکن اس کا رنگ وہ اب بھی مردے کی طرح زرد تھا۔ اس کی یہی رنگت دیکھ کر چارلس وہاں چوراہے کے قریب جھگل میں اس کی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا۔ اور یہ رنگت انتہائی سکون کی رنگت تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ بے جان بھی شاید ان دونوں لفظوں کا مطلب ایک ہی تھا۔ شاید اس دنیا میں سکون نہ مل سکتا تھا سکون تو قبر کے اس پار ہی میسر آ سکتا تھا۔ چارلس کانپ گیا لیکن موت بہتر تھی ہاں اس سے بہتر تھی کہ انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہے اس دھندلی دنیا میں زندہ رہے جہاں عفریت اور ڈانٹیں تھیں جو ان کی منحوس اور بھیا تک دنیا تھی بے شک اس سے موت بہتر تھی کہ انسان زندہ مرد بن جائے۔ اور ڈانٹا شاید وہ اسی دنیا میں پہنچ گئی تھی، اس کی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ وہ چارلس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اس نے گھوم کر پیچھے کھڑے ہوئے فادر شیشٹور کی کلائیاں پکڑ لیں اور تقریباً چیخ کر کہا۔

”آپ نے تو کہا تھا کہ میری بیوی“

”آپ کی بیوی کی حالت اطمینان بخش ہے۔“ فادر شیشٹور نے بڑے سکون سے

جواب دیا۔ ”چوبیس گھنٹے اور آپ کی بیوی پوری طرح صحتیاب ہو چکی ہو گی۔“

”کیسے یقین کر لوں!“

”آپ کو مجھ پر اعتبار ہے یا نہیں؟“

چارلس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر یقین کیجئے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا اور یقین کیجئے کہ فکر کی کوئی بات

نہیں ہے۔ خطرہ ٹل گیا اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہوش آجائے گا۔“



چارلس کی گرفت شینڈور کی کلائیوں پر ڈھیلی پڑ گئی اس کا سر شرم اور ندامت سے جھک گیا۔ اور اس کی انگلیوں نے شینڈور کی کلائیوں کو چھوڑ دیا اور اس کے ہاتھ تقریباً بے جان سے ہو کر اس کے دائیں بائیں لٹک گئے۔

”آئیے“ فادر شینڈور نے کہا۔

دونوں حجرے سے باہر آ گئے اپنی بیوی کو یوں بے سدھ پڑے دیکھ کر اور اس کے مردے کی بی رنگت دیکھ کر چارلس کے دل کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ حالانکہ اسے فادر شینڈور پر اعتبار تھا اور اس نے ڈانٹا کے روبہ صحت ہونے کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس پر چارلس کو یقین تھا تاہم وہ اپنی فکر و پریشانی پر قابو حاصل نہ کر سکا تھا۔

حجرے سے باہر آ کر فادر شینڈور نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور وہ دونوں پھر محرابی گزرگاہ میں چل پڑے ایک راہب گزرگاہ کے انتہائی سرے پر سے ان کی طرف آرہا تھا۔ یہ برادر مارک تھا وہی جس نے چارلس سے اس وقت گفتگو کی تھی جب اسے، یعنی چارلس کو ہوش آیا تھا۔

”فادر! لڈوگ آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔“ برادر مارک نے قریب آ کر کہا۔

فادر شینڈور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تو برادر مارک پلٹ کر جس طرح آیا تھا۔ اسی طرح خاموش اور متوازن قدموں سے چل دیا اور چارلس نے اپنی دل میں رشک کی ایک لہری محسوس کی، کس قدر خاموش اور پرسکون زندگی تھی ان لوگوں کی! اور چارلس نے سوچا کہ جب وہ اس خانقاہ سے چلا جائے گا اور جب وہ لندن کی روشنیوں

گزر گاہیں یکساں تھیں۔ ایک سوڑ مڑیے اور سامنے دوسری محرابی چھت ہوگی۔ دوسری گزر گاہ کے سامنے ہوگی۔ اب یہ خاموشی نیم تاریک اور سرد گزر گاہیں سکون بھی بخش سکتی تھی۔ یا پھر خوفزدہ بھی کر سکتی تھیں غالباً یہی وجہ تھی کہ فادریشٹور وقتاً فوقتاً فرار اختیار کرتا تھا اور اس خانقاہ میں سے نکل کر عارضی طور پر بیرونی دنیا کے شور اور گھما گھمی میں کھوجاتا تھا تاکہ اس کا دماغی توازن اس یکسانیت سے بگڑ نہ جائے یا اس کی طبیعت بگڑ نہ جائے ماحول کی یہ تبدیلی یقیناً اس دماغ کو جلاوتی تھی یا پھر وہ فرض تھا، کوئی اہم فرض، جو اسے خانقاہ میں سے نکال لاتا تھا اور ممکن تھا کہ خانقاہ کی یہ خاموشی اور یہ سکون اسے روحانی سکون بخشتا ہو، بہر حال یہ تو حقیقت تھی کہ اس خانقاہ کا ماحول چارلس کو سکون بھی بخش رہا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے اعصاب پر سوار بھی ہو رہا تھا۔

برلور مارک دوواڑے کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا فادریشٹور اور چارلس اس کے قریب پہنچے، تو اس نے کمر سے جھک کر دونوں کو سلام کیا اور دوواڑہ کھول کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

فادریشٹور اور چارلس حجرے میں داخل ہو گئے۔

یہ کمرہ نسبتاً بڑا تھا اور حالانکہ اس کا فرنیچر محض رسمی سا اور مختصر تھا، تاہم خدا جانے کیوں یہ کمرہ خاصاً آرام دہ معلوم ہوتا تھا اس میں کوئی خاص بات تو نہ تھی، البتہ اس کے کمین کی وجہ سے اس کمرے کو ایک قسم کی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔

لڈوگ طویل القامت شخص تھا اور اس کی آنکھیں جلتی ہوئی تھیں، جیسے کسی بھیڑیے کی آنکھیں ہوں۔ اس کی ایک ایک حرکت سے اعصابیب ہتھان اور سمجھ میں نہ آنے والی اندرونی بے چینی عیاں تھی۔ بظاہر وہ پرسکون معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ایک طرف پڑے ہوئے برش، رنگ کینواس کے ٹکڑے، کپڑوں کی دھجیاں اور دوسری بے

اور گھما گھمی میں پہنچ جائے گا تو پھر اس خانقاہ کی رہائی سکون اور خاموشی کو بھول جائے گا۔ یا کم سے کم اس کی کوشش ضرور کرے گا۔ لیکن پچھلے دن اور رات کی سنسنی کے بعد گزشتہ رات کے پاگل کردینے والے خوف کے بعد یہاں اسے سکون اور اطمینان نصیب ہوا تھا اور پچھلے خوف اور سنسنی سے اسے ایک حد تک نجات مل گئی تھی۔ چارلس نے کوشش کر کے یہ خیالات جھٹک دیئے۔ فادریشٹور بہر حال جذباتی اور تنگ نظر نہ تھا۔

”سٹر چارلس! میرے ساتھ آئیے۔“ فادریشٹور نے کہا اور اپنی رفتار تیز کر دی ”لڈوگ بے حد دلچسپ آدمی ہے۔ آپ کی طبیعت ذرا بہل جائے گی۔“

”کون ہے یہ لڈوگ؟“

”یہ بھی آپ ہی کی طرح ایک مسافر تھا ایک رات قعر ڈرائیولا کے قریب یہ مجھے مل گیا تھا اس نے یا تو کوئی انوکھی بات یا کوئی بھیاک چیز دیکھی تھی یا شاید کوئی خوفناک تجربے سے دوچار ہوا تھا۔ بہر حال اس کا دماغ چل گیا۔ اس کی یادداشت ختم ہو گئی اور میرے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے خود لڈوگ کے حق میں یہ اچھا ہی ہوا۔ میں اسے یہاں لے آیا اور پچھلے بارہ برس سے وہ ہماری خانقاہ میں ہی مقیم ہے۔ بے حد صابر اور راضی برضا قسم کا انسان ہے، یہ لڈوگ کو کسی بھی شیطانی قوت نے اسے اپنے اثر میں کیوں نہ لے لیا ہو، وہ اب اس اثر کو جھٹک چکا ہے اور اس شیطانی قوت کی گرفت سے آزاد ہے اب وہ ایک ہوشیار اور عمدہ دستکار ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا یہی شغل ہے اور دستکاری کی طرف اس کی یہی محبت ہے جس نے اس کی ان یادوں کو مٹا دیا ہے جو اس کے دماغ پر نقش ہو چکی تھیں۔ ان واقعات کی یادوں کو جن سے قعر ڈرائیولا کے قریب یا خود قعر میں دوچار ہوا تھا۔ اب وہ پرسکون اور مطمئن ہے اور اس شیطانی اثر سے آزاد جو کبھی اس کے لئے اذیت ناک تھا۔“

چارلس نے اس داغ کو پہچان لیا۔ ایک موٹی سی پگلی ہوئی کبھی تھی یہ۔

اور اب لڈوگ کو چارلس اور قادر شینڈور کی حجرے میں موجودگی کا احساس ہوا۔ اس کے باوجود وہ بڑی عیاری سے ان کی موجودگی کو ٹالنا بہادہ بدستور ہے جس اور بے پروا رہا۔ اس نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تک نہیں صاف ظاہر تھا کہ وہ جب تک چاہے گا۔ ان کی طرف نہ دیکھے گا اور اس طرح ان کی موجودگی کا اقرار نہ کرے گا۔ کسی کے بھی وجود کا اقرار نہ کرنے کی یہ ترکیب بڑی ہی مکارانہ تھی۔

لڈوگ کے ہونٹ مسکراہٹ کی صورت کھینچ گئے اور چارلس کو اس بھیرپے کی طرح نظر آیا جس کی چالاکی مگر آسانی سے اپنا شکار حاصل کر لیا ہو۔ لڈوگ کی شہادت کی اتنی آگے بڑھی اور پگلی ہوئی کبھی کو لڑھکانے لگی۔ میز کے ایک کونے پر دوسری کھیلوں کا جو سب کی سب مردہ اور پگلی ہوئی تھیں، ایک ننھا سا انبار تھا۔ لڈوگ نے تازہ پگلی ہوئی کبھی کو لڑھکا کر اس انبار میں ڈال دیا۔

قادر شینڈور آگے بڑھا۔

دھتتا "لڈوگ نے اپنے ایک ہاتھ کی ہتھیلی کا پیالا بنا کر میز کے کنارے عین نیچے رکھا" دوسرے ہاتھ سے میز کی سطح پر جھاڑوسی پھیر کر اس کے کنارے پر رکھی ہوئی کھیلوں کو سمیٹ کر ہتھیلی کے پیالے میں ٹپکا دیا، پھر اس کا یہ ہاتھ بلند ہو کر منہ تک پہنچا اور چشمِ زدن میں یہ مردہ کھیاں اس کے منہ میں تھیں لڈوگ جلدی جلدی منہ چلانے لگا۔ اور انہیں چبا کر نگل گیا۔

اور اب اس نے قادر شینڈور اور چارلس کی موجودگی کا اقرار کرتے ہوئے سر کے اشارے سے انہیں سلام کیا۔

"لڈوگ! یہ کیا؟" کھیاں؟" قادر شینڈور نے کہا۔

"لڈوگ نے مسرت سے سر ہلایا۔

مصرف چیزوں کا انبار لڈوگ کو پتلیوں کی صف میں سے نکال کر کارنگیوں کے گروہ میں لا کھڑا کرتا تھا۔ ایک قہنجی دراز میز پر ایک چوتھائی صفحہ جڑا ہوا تھا اور اس وقت لڈوگ برش ہاتھ میں لئے بڑی نزاکت اور مہارت سے اسی صفحہ پیشنگ کر رہا تھا وہ اپنی عجیب آواز میں کوئی سمجھ میں نہ آنے والا گیت گارہا تھا۔ لیکن اس کا ہاتھ چٹان کی طرح مستحکم تھا، چنانچہ اس نے صفحے پر جو لکیر پرش سے کھینچی تھی ہو ساہول کی ڈوری کی طرح سیدھی اور صحیح تھی۔

چارلس اور شینڈور حجرے میں داخل ہوئے تو لڈوگ نے اپنے آپ سے کہا "بے حد شاندار..... ہم..... میرا تو یہی خیال ہے..... یعنی حقیقت میں بے حد عمدہ۔"

اس نے برش رکھ دیا اور اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا، پھر ذرا جھکا کر یوں ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھایا۔ جیسے تلوار جھونک رہا ہو، کچھ دیر تک اس کا بازو ہوا میں اٹھا رہا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے نیچے چلا اور اس کی ہتھیلی دھڑام سے میز پر آ پڑی۔ ساتھ ہی لڈوگ کے بشرے کے جذبات میں تغیر ہوا، پہلے وہ ایک چسوی کا چہرہ تھا لیکن اب وہ ایک عیارِ شیطان کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے کے پٹھے کھینچ گئے تھے۔ نقوش اینٹھ گئے تھے اور آنکھوں میں صحیح معنوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔

وہ آنے والوں کی طرف ذرا بھی متوجہ نہ ہوا۔ وہ انہیں بھول چکا تھا۔ وہ ہر چیز کو بھول چکا تھا۔ ہر شے کے وجود سے بے پروا ہو چکا تھا اور فکر تھی تو صرف اس چیز کی جو اس کی ہتھیلی اور میز کی سطح کے درمیان دبئی ہوئی تھی۔ اب اس کے بشرے سے فتمندی کا جذبہ عیاں تھا۔ ایک ماہر اور عیارِ شکاری کی طرح اس نے اپنی ہتھیلی کو ایک کنارے پر سے ذرا اوپر اٹھایا اور سر جھکا کر اس میں جھانکنے لگا اور پھر آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ اٹھالیا..... میز کی سطح پر ایک کالا داغ نظر آرہا تھا۔

جیسے حروف اور حاشیے پر بنی ہوئی عمدہ اور سنہرے ڈیزائن کی دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ کئی دن بلکہ کئی ہفتہ اس باریک اور دیدہ ریزی کے کام کی نذر ہو گئے ہوئے۔

”کیا خیال ہے“ لڈوگ نے بیتابی سے پوچھا۔ ”نقیس اور عمدہ یا محض شاندار؟“
 قادر شہزاد آپ ہی آپ مسکرایا۔
 ”بے حد نقیس اور بے حد عمدہ۔۔۔ آپ کا کیا خیال ہے مسٹر چارلس؟“
 ”بے حد حسین۔“

لڈوگ نے سر ہلا کر کانڈ ان دونوں کے سامنے سے گھسٹ لیا
 ”ٹھیک ہے“ وہ بولا۔ ”اب تم جاؤ۔ جب مجھے ضرورت ہوگی۔ تو بلا لوں گا۔
 وہ دونوں اٹھ کر باہر آگئے۔ دروازہ کے باہر برادر اور مارک کھڑا ہوا تھا، اس نے
 فوراً ہی دروازہ بند کر کے اس میں قفل ڈال دیا۔
 ”یہ حیرت“ چارلس نے خدا جانے کیوں بے چینی محسوس کر کے دل ہی دل میں
 کہا۔ ”تقد خانہ کا کمرہ بن گیا ہے“
 اور پھر اس فی قادر شینڈور سے پوچھا۔
 ”قادر! یہ اعتباط کیوں؟“

”زادہ تر تو لڈوگ پر سکون رہتا ہے۔“ قادر شیشدور نے چلتے ہوئے جواب دیا۔
 ”اور زادہ تر وقت یہ بے ضرر بھی ہے لیکن کبھی کبھی اچانک پھٹ پڑتا ہے۔“
 ”یعنی؟“

”یعنی اس پر جنون کا دورہ سا پڑتا ہے پچھلی دفعہ جب اس پر دورہ پڑا تھا۔ تو اس نے ایک برادر پر حملہ کر کے اس کی کمپوزی پھاڑ دی تھی۔“

”میرے خدا! تو وہ برادر.....؟“

”دوا بھی ہے اور ناشتہ بھی۔“ وہ بولا۔

”دوا اور ناشتہ!“

”جی ہاں فادر، لیکن جلد ہی یہ مختصر سناٹہ شکم سیر کر دینے والا ڈنر بن جائے گا۔“

چارلس کو ہنسی ہو رہی تھی، آنتیں الٹ رہی تھیں لیکن فادر شیشدور یوں بے تعلق اور لاپرواہ رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کا لہجہ اب بھی دوستانہ اور آواز ٹھہری ہوئی تھی۔

”مجھ سے کہہ گیا ہے کہ تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔“

”تشریف رکھیے“ اس نے کہا اور حیرت انگیز قوت سے قریب رکھی ہوئی وزنی بچ گھسیٹ کر ایک طرف کر دی۔

”آپ بھی جناب تشریف رکھیے، اس نے چارلس سے کہا۔

وہ اٹھا اور میز کا چکر لگا کر دوسری طرف آگیا۔ اس کے جڑے اب بھی چل رہے تھے۔ اور بچی کچی مکھیوں کو پیس رہے تھے۔ چارلس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ لڈوگ کی طرف نہ دیکھے لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اول تو اس لئے کہ اس کے مضبوط جڑوں کی چلتی ہوئی چکی نے، جو مردہ مکھیوں کا آٹا بنا رہی تھی اسے صمور کر رکھا تھا اور پھر اس شخص کی آنکھوں میں کوئی عجیب قوت تھی جس نے چارلس کی نظر کو جکڑ رکھا تھا۔

”لب۔۔۔۔۔ لٹڈگ نے کہا۔ ”میں تیری جلد کا سروقہ مکمل کرچکا ہوں“

اس کی آواز میں کامیابی کی ایسی جھلک تھی کہ چارلس کو بھی غمک ہوا کہ لڑگوں کے اس اعلان پر فیٹی ہگل چلا اٹھیں گے اور خوشی کے شادیانے بجنے لگیں گے۔

اس نے ایک چرمی کاغذ اٹھا کر آنے والوں کے سامنے پھیلا دیا خود ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس پر ہنسنے ہوئے ڈیزائن کو تعریفی نظروں سے دیکھنے اور سر ہل کر خود اپنے فن کی داد دینے لگا چارلس آرٹ اور فن کا نقاد نہ تھا، لیکن وہ بھی صاف عمدہ اور موتوں

دھننا وہ خاموش ہو گیا ایک قدم دروازے کی طرف بڑھا اس کے ماتھے پر
سولیس ابھر آئیں اس نے اپنا سر نفی میں ہلایا اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔
”نہیں۔ صورت حال ایسی ہے کہ ہم خانقاہ کے دروازے نہیں کھول سکتے اور
کونے بھی نہیں چاہئیں۔ کسی کے لئے بھی نہیں۔ خواہ وہ دنیا کے دوسرے سرے
سے ہی کیوں نہ آیا ہو۔“
برادر مارک نمایاں طور پر چونکا۔

”ہم جب تک اس مسئلے پر اطمینان بخش طور پر بحث اور پورے معاملے پر ہر پہلو
سے غور نہیں کر لیتے تب تک ہمیں کسی اور طرف متوجہ نہیں ہونا ہے“ قادر شینڈور
نے کہا ”اور خیال رہے کہ کوئی چیز باہر سے اندر نہ لائی جائے کسی صورت میں نہ لائی
بلکہ نہ قصداً اور نہ اتفاقاً برادر مارک! چمکڑے والے سے کہہ دو کہ ہم اسے
نفاذ میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ البتہ وہ باہر جہاں چاہے قیام کر سکتا
ہے اس کا کھانا باورچی خانے سے بھیجوا دیا جائے گا۔“

دنیا کے اس حصے میں شام کا دھندلا دھننا چھا جاتا تھا بالکل اس طرح جیسے سمندر
میں لہ کے بعد فوری طور پر جزر شروع ہو جائے۔ سورج کے پھاڑیوں کے عقب میں
باتے ہی اس ولوی پر اندھیرے کی چادر پھیلنے لگتی جو رفتہ رفتہ سے زیادہ گہری ہونے
لگتی اور ارد گرد پھیلے ہوئے جنگلات اس سرعت سے بڑھتے ہوئے اندھیرے کو اذر
کی گاڑھا کر دیتے۔

مطالعہ گاہ میں پہنچ کر قادر شینڈور نے ایک لالٹین جلائی اور اپنی میز پر رکھ دی تھی
ا طرف سے فرمت پاکر وہ دو جام اور ایک صراحی لے آیا۔
”یہ مقامی شراب ہے“ قادر شینڈور نے شراب چارلس کے پیالے میں اتار دینے
سے کہا ”اور یہ اس علاقے کی بہترین شراب ہے۔“

”شکر ہے کہ بچ گیا۔ آؤ ابھی ہمیں بہت سے مسائل پر بحث کرنی ہے۔“

ایک خانقاہ کی گزر گاہیں گھنٹی کی آواز سے گونج اٹھیں، گھنٹہ خاموش ہو گیا اس
کی آواز مدھم ہو کر ڈوب گئی۔ تو گھنٹہ پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے دودھ بجا گیا۔
چارلس نے سوچا کہ عبادت کا وقت آگیا تھا اور گھنٹے کی یہ آواز راہبوں کو عبادت کے
لئے بلاری تھی بہر حال اسے گھنٹے کی یہ آواز بڑی ہی بے سری اور بھدی معلوم ہوئی۔
برادر مارک جوان دونوں کے پیچھے اور چند قدم دور چل رہا تھا۔ ایک دم سے اپنی
رفتار تیز کر کے آگے بڑھا اور ان کے قریب سے نکلا چلا گیا۔

چارلس اور قادر شینڈور خاموشی سے آگے بڑھتے ہوئے گزر گاہ کے اس موڑ پر
پہنچ گئے جس کے عین سامنے ایک مختصر ڈیوڑھی تھی اور اس کے سرے پر اسکا بڑا
بے ڈھنگا مگر مضبوط دروازہ تھا۔ برادر مارک نے اس دروازے کے قریب پہنچ کر کواڑ
میں بنی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی کھولی اور دروازے کے باہر کسی سے کچھ پوچھنے لگا۔
قادر شینڈور نے رفتار دھیمی کر دی کہ معلوم کرے برادر مارک کیا کہتا ہے اور اب
چارلس نے دیکھا کہ وہ بے سری آواز گھنٹے کی نہیں بلکہ اس غیر معمولی طور پر بڑی اور
زنگ آلود گھنٹی کی تھی جو دروازے کے ماتھے پر لگی ہوئی تھی۔

برادر مارک ان دونوں کی طرف گھوم گیا۔

”کیا بات ہے برادر؟“ قادر شینڈور نے پوچھا۔

”باہر ایک چمکڑے والا کھڑا ہے“ برادر مارک نے جواب دیا ”اور وہ سہ پہر اور
رات یہاں گزارنے کے لئے درخواست کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ وہ بہت دور سے آیا
ہے بے حد تھکا ہوا ہے۔“

قادر شینڈور نے کہا۔ ”ہماری مہمان نوازی ضرب النثل ہے اور خانقاہ کے
دروازے ہر مسافر کے لئے کھلے ہیں اور۔۔۔۔۔“

اس کے بعد آپ نے یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا ہے تو۔۔۔۔۔“
چارلس نے فنی میں سر ہلایا۔

”قادر شینڈور میں اس وقت تک یہاں سے نہ جاؤں گا جب تک کہ وہ دوزخی
لہت فنا نہیں ہو جاتا۔“

قادر شینڈور نے ”بہت اچھا“ کے سے انداز میں سر ہلایا۔ اس کے بشرے سے
اُپر ہوتا تھا جیسے اسے چارلس کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا ہے۔

تام چارلس کو احساس ہوا کہ قادر شینڈور کو اس سے اسی جواب کی توقع تھی۔
”جیسی آپ کی مرضی“ قادر شینڈور نے کہا۔ ”لیکن آپ کی بیوی کو کسی بھی حال
نہاں نہیں رہتا ہے۔ جب وہ ستر کے قابل ہو جائیں گی تو ہم فوراً ہی انہیں
مکمل سمجھ دیں گے۔ اور وہاں وہ محفوظ ہوں گی۔ اور ہم خود ان کی طرف سے
لٹن ہو کر یکسوئی سے وہ کام کر سکیں گے۔ جو ہمیں کرنا ہے۔ ہم قعر ڈر کیولا کا گوشہ
بہ چمان ماریں گے۔ اور وہ بھٹ تلاش کر لیں گے جہاں یہ عفریت آرام کرتا ہے
اور اسے تلف کر دیں گے اور اس دفعہ کوئی ایسی لغزش نہ ہو گی جس کی وجہ سے
اُس کے دوبارہ زندہ ہونے کا امکان باقی رہے۔“

لیکن ہم اس وقت قعر کی طرف کیوں نہ نہ روانہ ہو جائیں۔
”نہیں مسٹر چارلس۔“

”کیا مشکل ہے اس میں؟“

”گزشتہ رات ایک شکار کونٹ ڈر کیولا کے ہاتھ میں اگر نکل گیا ہے۔“
”کون شکار؟“

”آپ کی بیوی“

چارلس لرز گیا۔

اور انہوں نے نیالے اپنے ہونٹوں سے لگا لئے۔

شراب غیر معمولی طور پر تیز تھی چنانچہ اس کی تھنی چارلس نے اپنے دانتوں کی
دندوں اور زبان پر شدت سے محسوس کی لیکن اس کے حلق سے نیچے اترتے ہی اس
کی رگ رگ میں ایک گرمی سی دوڑ گئی اور اس نے جلی خوف ایک حد تک زائل
ہو گیا جو اندھیرا اترتے ہی اس کے دل پر چھانے لگا تھا۔

چارلس نے کہا۔۔۔۔۔ ”اگر وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ ڈر کیولا آج رات اپنی قبر سے نکل آیا
۔۔۔۔۔“

”وہ زندہ ہو چکا ہے۔ مسٹر چارلس چنانچہ وہ اپنی قبر میں سے ضرور نکل آئے گا۔
اسے شکار کی تلاش ہو گی کیونکہ وہ اپنی تمام پچھلی قوتیں حاصل کرنے کے لئے بے قرار
ہو گا تاکہ وہ ایک بار پھر جب چاہے بھیڑیا یا چکا ڈھن کر خون چوس سکے۔“

”اور اگر وہ یہاں۔۔۔۔۔“

”اطمینان رکھو وہ یہاں نہیں آسکتا۔ خیر تو اب مناسب ہو گا کہ ہم اپنے عمل کا
پورا نقشہ مرتب کر لیں۔“

”فرمائیے۔“

”آپ نے کہا تھا کہ ڈر کیولا کو فنا کر دینا آپ کا فرض ہو گیا ہے۔ یا آپ اسے اپنا
فرض سمجھتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔“

”جی“

”لیکن مسٹر چارلس چونکہ میں ایک راہب ہوں اس لئے آپ کے اس جذبے
کی تعریف نہیں کر سکتا اور نہ ہی آپ کو انتقام یا سزا دینے کا مشورہ دے سکتا ہوں۔ یہ
کام انسانوں کا نہیں ہے۔ انتقام لینا اور سزا دینا خدا کے کام ہیں۔ بہر حال اب اگر
آپ پورے مسئلے پر غور کر چکے ہیں اور جان چکے ہیں کہ ڈر کیولا ایک عفریت ہے اور

५५

اس نے کہا ”میں..... دراصل..... او..... اپنا اطمینان کر لیتا چاہتا ہوں..... کہ..... محفوظ ہیں۔ تاہم آپ ہو۔ آئیے ان کے پاس‘ آئیے‘ میں آپ کو ان

”آپ کا مطلب ہے لہسن کے غنچے؟“

کے حجرے کا راستہ دکھا دوں گا۔“

اور وہ مطالعہ گاہ سے باہر نیم روشن گزرگاہ میں چل پڑے اور کچھ ہی دیر بعد ایک حجرے کے دروازے کے سامنے تھے۔

چارلس اگر ہوتا تو اس حجرے تک نہ پہنچ پاتا۔ اور اگر پہنچ جاتا تو اسے پہچان نہ سکتا تھا، کیونکہ گزرگاہیں ایک سی تھیں اور دروازے بھی ایک سے تھے۔ چارلس نے سوچا کہ اس خانقاہ میں کئی دنوں کے قیام کے بعد بھی وہ کسی خاص حجرے کو نہ پہچان سکے گا اور یہ کہ اس خانقاہ کے راہبوں کو یہاں کے راستے اور حجرے کس طرح یاد رہتے ہوں گے۔

ڈائنا کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ لیکن جب چارلس اس پر جھک گیا تو اس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول دیں، پہلے تو وہ چونکی پھر مسکرا کر اپنی باہیں اس کی گردن میں ڈال دیں۔

”چارلس، میرے پیارے“ اس نے کہا۔

”ڈائنا!“

”تمہیں کچھ ہوا تو نہیں!۔۔۔ یعنی۔۔۔ اچھے ہونا؟“

”بالکل۔“ چارلس، چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا۔

قادر شیشدور باہر ہی رک گیا تھا۔ اور وہ اپنے خیالات میں الجھا ہوا اب بھی وہاں کھڑا تھا۔

”ہمیں سب سے زیادہ فکر تمہاری تھی“ چارلس نے کہا ”اور فی الحال سب سے ضروری اور اہم بات یہ ہے کہ تمہیں جلد رستہ یاد دیا جائے کہ تم لندن تک منہ کر سکو۔“

ڈائنا کا چہرہ دک اٹھا۔

”یعنی کمر؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“

میں گھر پہنچنے کے لئے اس قدر ہتھاپ ہوں کہ کیا تاؤں۔ میں جلد از جلد یہاں سے رخصت ہونا چاہتی ہوں۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ جو کچھ ہوا ہے اس سے دور چلی جانا چاہتی ہوں۔“

اس نے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چارلس!“

”ہم۔“

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ سب خواب تو نہ تھا۔ حقیقت تھی نا۔“

”ہاں ڈائنا وہ حقیقت تھی۔ کاش کہ وہ خواب ہوتا۔ لیکن ایک بار تم یہاں سے درجلی جاؤ گی تو پھر۔۔۔“

”ہم کب چل رہے ہیں؟“

چارلس شش و پنج میں پڑ گیا اور پھر چند ثانیوں کے توقف کے بعد بولا۔

”ہم نہیں، صرف تم۔“

”کیا مطلب؟“

”ڈائنا! میں تمہارے ساتھ نہ جاؤں گا۔ کم سے کم فی الحال نہ جاسکو گا۔“

”کیوں؟“

”یہاں مجھے ایک اہم فرض انجام دینا ہے۔“

”تم وہاں اس منحوس قصر میں دوبارہ تو نہیں جا رہے؟“ ڈائنا نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔

”میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے ڈائنا۔“

”نہیں۔ کل نہیں۔ اسی وقت اور ابھی۔“

چارلس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ڈائنا اس سے پٹ گئی۔

”نہیں۔ میں تمہیں نہ چھوڑوں گی۔“ وہ بولی۔ ”اس وقت تک نہیں جب تک تم زندہ رہو۔“

عین اسی وقت فادر شینڈور حجرے میں آگیا۔

”مزکینٹ! آپ زیادہ نہ بولیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کو مکمل آرام کرنا ہے۔ یہ بے حد ضروری ہے۔“

”فادر انہیں سمجھائیے۔ خدا کے لئے بتائیے انہیں کہ وہاں جانا پاگل پن ہے۔“
فادر شینڈور، چار پائی کے قریب آکھڑا ہوا۔ اس نے مسکرا کر ڈانٹا کہ ہاتھ پرانا رکھ دیا۔

”سنز کینٹ! آپ کے شوہر نے یہ ٹھیک ہی کہا ہے۔ اس کے متعلق ہم کل گفتگو کریں گے۔“

”اس نے چارلس کو چارپائی پر سے اٹھایا۔ اور ہاتھ پکڑ کر اسے حجرے سے باہر لے آیا۔ ڈاکٹار نے ان دونوں کو آوازیں دیں۔ لیکن وہ بڑھال ہو کر ڈھمکے۔“

باہر آکر قادر شیشدور نے دروازہ بند کر دیا اور کہا
کل صبح وہ ٹھیک ہو جائیں گی اور اس وقت ہم انہیں سمجھا سکیں گے کہ ہمیں کیا
کرنا ہے۔“

”وہ بڑی ضدی عورت ہے قادر۔“ چارلس نے کہا۔

اور یکایک اس کے دل میں اپنی بیوی کی محبت کی ایسی لہرائیں اٹھیں کہ اس کا جی چاہا کہ

دوڑ کر ڈانٹا کے پاس جائے اور اسے اپنے سینہ سے لگا لے

”ہاں ہوگی“ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں سمجھتا ہوں وہ ایک وقار اور فرماں بردار بیوی بھی ہے۔“

چارلس نے اثبوت میں سر ملادیا۔

”میری مانیجے اور آج آپ بھی جلدی سو جائیے“ قادر شہنشاہ نے بات کو گویا اختتام تک پہنچاتے ہوئے کہا۔

”آپ بہت زیادہ ٹھکے ہوئے ہیں چاہے خود آپ کو اس کا احساس نہ ہو۔“

”احساس کیوں نہیں ہے قادر؟ لیکن.....“

”آپ فکر نہ کریں اور اطمینان سے سو جائیں۔ بے فکر ہو کر۔ ہمارے دروازے مضبوطی سے بند ہیں۔ آپ اور آپ کی بیوی محفوظ ہیں۔“

”آج رات کوئی دشمن اس خانقاہ میں قدم نہ رکھ سکے گا۔“

تھے۔ ایک کمری کے شیشے پر جمجھوری جمجھوری انگلیاں رنگ رہی تھیں، کوئی باہر کھڑا

کمر کی کے شیشے کو ماتنوں سے یوں کمرچ رہا تھا جیسے وہ شیشہ نہیں کاغذ ہو۔ کچھ دیر کی تاہم کو شش کے بعد وہ بھوری انگلیاں شیشے پر سے ہٹ گئیں۔

خانقاہ کے دروازے اور کمریاں مضبوطی سے بند تھیں۔

چنانچہ خوف کی کوئی بات نہ تھی۔



دی تھی یا یہ آواز اس کے پریشان دماغ میں پیدا ہوئی تھی۔
پھر وہی آواز سنائی دی۔

شاید بلکہ یقیناً درختوں کی ٹہنیاں ہوا کے جھونکوں کی تاب نہ لا کر دیوار سے ٹکرا
رہی تھیں۔ بارش کے قطرہوں کی بو چھاڑ خانقاہ کی نیچی چھت پر بج رہی تھی، باہر طوفان
باد ہمارے زوروں پر تھا۔

اب تین دفعہ دستک دی گئی۔

تو از صاف اور واضح تھی۔ اب کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی یہ
اس کا وہم نہ تھا۔ حقیقت میں کوئی دستک دے رہا تھا۔

ڈانٹا ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔

کھڑکی کے شیشے اندر سے دھندلا گئے تھے اور باہر دھندلا رہی تھی لیکن کھڑکی
کے باہر اور اس کے شیشے سے چپکا ہوا چہرہ اسے صاف نظر آ رہا تھا

ہیلن کا بگڑا ہوا، گرنٹاک اور ہتھی چہرہ۔

ڈانٹا کانپ گئی۔ وہ جہاں تھی وہیں بیٹھی رہی۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی
جرات نہ کر سکی۔ وہ چیخا چاہتی تھی لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل رہی
تھی۔

”رحم کرو۔“ ہیلن کے ہونٹ ہلے۔

ڈانٹا بت بن گئی۔

”رحم کرو“ ہیلن ایسی آواز میں التجا کر رہی تھی جو مشکل سنی جاسکتی تھی۔

ڈانٹا نے اپنی ٹانگیں نیچے لٹکادیں۔ وہ بستر میں سے نکل آئی۔ لیکن جیسے ہی اس
کے پیروں نے حجرے کی سطحیں اور ٹھنڈے فرش کو چھوا کہ اس کے رگ و ریشے میں
برقانی خوف سرایت کر گیا اور اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر حجرے سے نکل جائے اور

باب-۸

پناہ گاہ قید خانے میں تبدیل ہو گئی۔ دیواریں ایک دم سے جھک آئیں۔ وہ اسے
پینے کے لئے آگے بڑھ رہی تھیں اور ڈانٹا اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی
تھی۔ وہ کچھ جاگنے کے عمل میں تھی اور کچھ نیند میں تھی اور اسی عالم میں اس نے
یوں محسوس کیا۔ جیسے وہ قعر ڈرگولا میں ہے کوئی اسے گھیر کر ایک کونے میں لے آیا
ہے اور گوئی ایسی چیز جس کا چہرہ نہیں ہے اپنے بڑے بڑے بازو پھیلائے، اس کی
طرف آ رہی ہے اس پر حملہ آور ہو رہی ہے اس چیز کا چہرہ نہ تھا۔ شاید اس لئے کہ
وہ اس چہرے کے ظالمانہ نقوش کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھی دو خونخوار پنجے اس کی
حلق کی طرف بڑھے اور دیوانہ وار اپنے دونوں ہاتھ چلا کر ان پنجوں کو پیچھے ہٹانے
لگی۔

لیکن یہ صرف خواب تھا۔ کبل کا صرف ایک کونہ اس کے ایک گال سے رگڑ
کھا رہا تھا۔ اور جب اس نے ہاتھ چلائے تو کبل اس کی مٹھی میں تھا اس نے کبل
اپنے اوپر سے گھسیٹ لیا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں اور ایک منٹ تک حجرے کی نیچی چھت کی طرف
دیکھتی رہی وہ اپنے بے وجہ خوف پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن اس
کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ کیا حماقت تھی؟ حماقت تو نہیں البتہ عجیب بات
ضرور تھی اس کا دل کیوں دھڑک رہا تھا حالانکہ اس خانقاہ میں وہ محفوظ تھی اور اس
دو زخمی ہستی کی دست سے باہر جس سے قعر ڈرگولا میں اس کا سابقہ پڑ چکا تھا۔

دستک کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

ڈانٹا بے حرکت پڑی رہی وہ یقین سے کہہ نہ سکی تھی کہ واقعی کسی نے دستک

گئی۔ چنٹی کل گئی تو وہ دست پکڑ کر کھڑی ایک ہٹ کھولنے لگی۔ آہستہ آہستہ ہچکچاتے ہوئے۔

ہوا کا ایک تیز جھوٹا اندر گھس آیا۔ اس میں استرے کی سی کاٹ تھی اور کھڑکی کھلتے ہی گاڑھی دھند کی دھندلک زدہ چیز کی طرح اچک کر اندر در آئی ہیلن کے ہونٹ اس کے دانتوں پر کھنچ گئے۔ وہ احساس فتح مندی سے ہوٹے ہوئے غراری تھی۔ دھند کے مرغلوں میں سے وہ ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے نکل آئے اور دوسرے ہی لمحے ڈانکا کی کلائی ایک آہنی گرفت میں تھی۔ یہ ہیلن تھی جس نے اس کی کلائی پکڑ لی تھی اور اس کی یہ پکڑ بڑی بیدردانہ تھی۔ ڈانکا نے اپنی کلائی اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اس نے چاہا کہ وہ پیچھے ہٹ کر اپنے حجرے کے انتہائی سرے پر پہنچ جائے۔ وہاں وہ محفوظ ہوگی۔ لیکن ہیلن نے اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ اور اب اس کا سر تیزی سے جھکا اور اس کے دو تیز اور لالہ آنے اور کیلے دانت ڈانکا کی کلائی میں گڑ گئے۔

ڈانکا درد و تکلیف اور خوف سے چیخ پڑی۔ فوراً ہی ہیلن نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر غائب ہو گئی لیکن دوسرے ہی لمحے کھڑکی کے چوکھٹے میں ایک اور چہرہ جزا نظر آیا۔ لمبوتر، کھنچا ہوا، اور بھیاک چہرہ۔ کونٹ ڈر نکلا۔ اور اس نے اپنے دونوں پنجے پھیلائے اور سرخ دھاری دار اور سیاہ لبوں کے دونوں کونے پکڑ کر اسے یوں اٹھا رکھا تھا جیسے وہ ڈانکا کو اپنی دم گھونٹ دینے والی آغوش میں سمیٹ لے گا۔

ایک ڈانکا کی پشت کی طرف سے ایک دھماکی کی آواز سنائی دی اور حجرے کا دروازہ کل گیا ڈر نکلا تیزی سے پیچھے ہٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے اندر سے غائب ہو گیا بالکل اسی طرح جس طرح شکاری پرندہ کوئی غیر متوقع آواز سے گھبرا کر اور اپنا شکار

چارلس کے پاس پہنچ جائے۔

لیکن وہ ایسا نہ کر سکی اس کے قدم فرش میں گڑے گئے۔ ہیلن کھڑکی کے شیشے پر اپنے پنجے چلا رہی تھی اور دیوانوں کی طرح جلدی جلدی اور عجیب عجیب منہ بنارہی تھی۔ ڈانکا نے اپنے آپ کو بدکنا چاہا لیکن روک نہ سکی جیسے وہ اپنی مرضی کی مالک نہ رہی تھی۔

ڈانکا کے قدم بے اختیار کھڑکی کی طرف اٹھ گئے۔

ہیلن کے چہرے کا رنگ حیرت انگیز حد تک سفید تھا جیسے اس کے بدن میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ رہا ہو اور اس کے بشرے سے عجیب طرح کا کرب اور بھوک عیاں تھی۔

ڈانکا کھڑکی کے قریب پہنچ چکی تھی چنانچہ اس کی آواز سن سکتی تھی۔

”ڈانکا! رحم کرو میرے حال پر۔ مجھے اندر آنے دو۔ باہر بہت زیادہ سردی ہے۔“

میں ٹھہر رہی ہوں ڈانکا۔ رحم کرو مجھ پر۔“

ڈانکا شش و پنج میں پڑ گئی۔ اس نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا کاش کہ چارلس وہاں آجائے۔ کاش کہ فلور شینڈلر کہیں قریب ہی ہوتے اور پھر وہ فیصلہ کرتے کہ کھڑکیاں کھولی جائیں یا نہیں۔

”ڈانکا! میری اچھی بہن۔ میں درخواست کرتی ہوں۔“ ہیلن کا چہرہ انتہائی مایوسی کے عالم میں شیشے سے چپک گیا تھا۔ گھبراؤ نہیں ڈانکا۔ اب سب ٹھیک ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں وہاں سے بھاگ آئی ہوں رحم کرو ڈانکا۔ مجھے اندر آنے دو میں مختصر رہی ہوں اور پھر۔ پھر۔ اگر وہ۔ میرا تعاقب کرتا ہوا یہاں آگیا اور مجھے پکڑ کر لے گیا تو پھر کوئی مجھے اس کے پنجے سے چھڑانہ سکے گا۔“

ڈانکا نے چند ثانیوں کے توقف کے بعد اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور چنٹی نیچے سرکانے

چارلس نے ڈانکا کا ہاتھ پکڑ کر قادر شیشور کی طرف لمبا کر دیا اور اسے اس طرح موڑ دیا کہ کلائی پر دونوں سوراخ اور ان میں سے قطرہ قطرہ لگتا ہوا خون اوپر آگیا۔ قادر شیشور نے اپنے بائیں ہاتھ سے ڈانکا کی انگلیاں ایسی مضبوطی سے پکڑ لیں کہ وہ انہیں ہلا بھی نہ سکتی تھی۔ اب اس نے وہ لیپ جسے وہ دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ ڈانکا کی کلائی پر جھکا دیا یہاں تک کہ اس پر چڑھا ہوا اور پٹنا ہوا شیشہ ڈانکا کی کلائی پر کے سوراخوں سے چھو گیا۔

درد و تکلیف کی آتش لہر اس کی کلائی سے اٹھی اور اس کے بازو میں سے گزرتی ہوئی پورے بدن میں دوڑ گئی۔ وہ سر سے پیر تک جیسے اندر ہی اندر جل اٹھی۔ وہ چیخ اٹھی اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن چارلس نے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا اور پھر قادر شیشور جیسے طاقت ور آدمی کو جھک دینا ممکن بھی تو نہ تھا۔

یہ جلتا ہوا درد ختم ہونا چاہتے۔۔۔ اسے روک دینا چاہتے۔۔۔ وہ گیلی کٹری کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔۔۔ اس کا خون دیکتے ہوئے لاوے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی ہڈیاں پٹنک رہی تھیں۔ اس کا دماغ دھلکا ہوا انگارہ بن چکا تھا۔۔۔ اس کے دل کو اتیشی میں پر بھونا جا رہا تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔۔۔ چنانچہ مسلسل چیخ رہی تھی۔

”خدا کے لئے قادر!“ چارلس بے قابو ہو کر چلایا۔ ”لیس اب بہت ہو گیا“

قادر شیشور نے ڈانکا کی کلائی پر سے لیپ اٹھالیا۔ درد کی لہروں میں کمی واقع ہو گئی۔ لیکن جلے ہوئے گوشت پر ٹھنڈی ہوا کا اثر یہ ہوا کہ تکلیف کی شدت دہنی ہو گئی۔ ڈانکا کراہ کر پیچھے کی طرف ڈھسے گئی۔ اس کی اعضا ڈھیلے پڑ گئے۔ تاہم اسے اتنا ہوش ضرور تھا کہ وہ یوں محسوس کر رہی تھی کہ کوئی اسے آہستہ سے اٹھا کر بستر پر لٹا رہا

چھوڑ کر پرواز کر جاتا ہے۔

ڈانکا پیچھے کی طرف جھونک کھا گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ گر رہی تھی لیکن فوراً ہی دونوں ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔

یہ چارلس تھا جو سارا دے کر اسے چارپائی کی طرف لئے جا رہا تھا۔

”کیا ہوا قادر شیشور کی آواز سنائی دی۔“

”ڈانکا کو کچھ دھندلا سا احساس ہوا کہ قادر شیشور حجرہ عبور کر کے کھڑکی کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے کھڑکی بند کر کے چٹنی لگادی، چارپائی کے قریب آیا اور ڈانکا پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ چارلس نے احتجاج کیا قادر شیشور نے اسے ایک طرف ڈھکیل دیا۔ ڈانکا کے دونوں شانے پکڑ لئے اور بڑے غصے کے عالم میں اسے جھنجھوڑنے لگا۔“

”بتاؤ کیا ہوا؟“ بتاؤ“ اس نے کڑک کر پوچھا۔

ڈانکا نے بے بسی سے اپنے ہاتھ چارلس کی طرف پھیلا دیئے۔ موخر الذکر بے اختیار اس کی طرف بڑھا لیکن پھر فوراً ہی اس کے قدم رک گئے اور اس کا خون سرد ہو گیا۔

وہ پٹٹی پٹٹی آنکھوں سے ڈانکا کی اس کلائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس پر وہ چھوٹے سے سوراخ تھے۔ قادر شیشور نے بھی ڈانکا کے ہاتھ پر دونوں سوراخ دیکھ لئے۔

”خدا یا!“ وہ غرایا ”مسٹر چارلس! پکڑے رہو۔ انہیں۔“

قادر شیشور نے ڈانکا کو چھوڑ دیا۔ وہ آزاد تھی۔ فوراً ہی چارلس نے آگے بڑھ کر اپنا بازو اس کی کمر میں ڈال دیا۔ قادر شیشور نے وہ لیپ اٹھالیا جو ایک کونے میں میز پر رکھا جل رہا تھا۔

”جی ہاں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ۔۔۔“

”ہم۔۔۔ ہمیں پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا“ قادر شینڈور نے جلدی سے کہا۔ اور

چارلس کی طرف گھوم کیا ”آئیے میرے ساتھ۔“

چارلس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

”آپ ان کی نگرہ کریں۔“ قادر شینڈور نے چارلس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا

تھا۔ ”برادر مارک ان کا کلائی پر پٹی کس دیں گے اور اسی حجرے میں رہیں گے۔“

ایک بار پھر ڈانکا اپنے ہاتھ بٹھا کر چارلس سے لپٹ جانا چاہتی تھی وہ چاہتی تھی

کہ اس کا شوہر اس کے قریب ہی رہے۔ لیکن وہ تو قادر شینڈور کے ساتھ جا رہا

تھا۔ اور وہ دونوں چلے گئے۔ خاموش گزر گاؤں میں سے ان کے پیروں کی چاپ کچھ

دیر تک سنائی دیتی رہی اور پھر دور ہو کر ڈوب گئی۔

ڈانکا نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی نگاہیں برادر مارک کی پر خلوص ہمدرد اور

ساتھ ہی ساتھ شکر نگاہوں سے کھرا گئیں۔

”میں بیٹھا چاہتی ہوں“ مرادہ آواز میں کہا۔

فورا ہی برادر مارک نے آگے بڑھ کر اپنی دونوں ہتھیلیاں اس کے شانوں کے

مچھے لٹکائیں اور اس طرح سارا دے کر اسے آہستہ سے اٹھا کر بٹھا دیا۔ ”اس طرح

بٹی کس نے میں بھی آسکتی ہوگی۔“ برادر مارک پٹی کس چکا تو اس کے بعد بھی وہ بیٹھی

رہی۔ وہ لیٹنا نہ چاہتی تھی وہ سونا نہ چاہتی تھی۔۔۔۔۔ وہ جانتا اور بیٹھے رہنا چاہتی تھی

کہ خواب پریش کی وہ بے یگانہ صورت اسے پھر نظر نہ آئے وہ۔۔۔ وہ مغربیت کھڑکی

میں پھر نمودار نہ ہو۔

ڈانکا خاموش تھی تاہم برادر مارک سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ چنانچہ وہ حجرے کے

استثنائی سرے پر رکھی ہوئی ایک کرسی میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ گود میں

تھا اور پھر وہ قادر شینڈور کی آواز بھی سن رہی تھی جو بہت دور سے آتی ہوئی معلوم

ہوتی تھی۔ کہیں گمراہیوں میں سے آ رہی تھی۔

”برادر مارک! مریم لگا کر پٹی کس وہ“ قادر شینڈور کہہ رہا تھا۔

اور چارلس قریب ہی تھا۔ بہت قریب۔ وہ شاید اس پر جھکا سر کوٹھی میں کچھ کہہ

رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنی باہیں چارلس کی گردن میں ڈال دے لیکن وہ ایسی محسن

محسوس کر رہی تھی کہ انگلی تک نہ ہلا سکتی تھی اور پھر اس خیال سے خوف زدہ بھی تھی

کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا ذرا سی حرکت اس دوزخی تکلیف کی لمبوں کو اس کے جسم

میں ایک بار پھر دوڑا دے۔

”شکر ہے کہ ہم عین وقت پر پہنچ گئے۔ قادر شینڈور نے کہا۔

قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ ڈانکا نے اپنی کلائی پر ٹھنڈک سی محسوس کی۔

کوئی ٹھنڈی چیز اس کی کلائی پر چڑی جا رہی تھی۔ کچھ لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ

ٹھنڈی چیز اس کی کلائی پر سرد آگ کی طرح سلگ اٹھی چند سیکنڈ تک یہ سرد آگ

نا قابل برداشت رہی اور پھر اس نے درد کی ٹیسوں کو ماند کر دیا۔ برف آگ سے دست

و کر رہاں تھی۔ ڈانکا نے کچھ اور سوچنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی جسم کے دوسرے اعضاء

کی طرف متوجہ ہونا چاہتی تھی لیکن اس بازو میں وحشت کا ہوا درد ایسے کسی اور طرف

متوجہ نہ ہونے دیتا تھا اور دوسرے تمام احساسات پر غالب تھا۔

”خانقاہ میں مسافر تو مقیم نہیں ہیں؟“ قادر شینڈور پوچھ رہا تھا۔

”خانقاہ میں کوئی مقیم نہیں ہے قادر“ برادر مارک نے جواب دیا۔ خود آپ ہی کا

حکم تھا کہ کسی کو بھی خانقاہ میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ لیکن ایک چھکڑے والا چلا

آیا تھا۔ وہ خانقاہ سے باہر مقیم ہے۔ اس کے لئے کھانا بھیج دیا گیا ہے۔“

”چھکڑے والا!“ قادر شینڈور چونکا۔

رکے کسی خیال میں غرق تھا۔ ڈانٹا جانتی تھی کہ اگر اس نے بولنا چاہا تو برادر مارک فوراً اس سے مصروف گفتگو ہو جائے گا اور اسے تسلیم دے گا۔ لیکن اس وقت وہ کچھ کہنا نہ چاہتی تھی۔ وہ سکون اور خاموشی چاہتی تھی اور..... برادر مارک بھی خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

دروازے پر کسی نے ناخن کھسے اور ”خر... خر“ کی ایک ہلکی سی آواز نے خاموشی کے اس سحر کو توڑ دیا۔ برادر مارک چشم زدن میں کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔



ایک اجازت صورت اور وحشت ناک آنکھوں والا شخص دروازے میں کھڑا ہوا۔ وہ کچھ کھڑا تھا اور کچھ سنا ہوا تھا یوں سمجھئے کہ وہ اس کتے کی طرح دھکا ہوا تھا جس کی پیٹھ پر پڑنے کے لئے آقا کا ڈنڈا بلند ہو چکا ہو۔ لیکن ڈانٹا کو وہ اس بھیڑیے کی طرح معلوم ہوا جو شکار پر یاد دشمن پر جھپٹنے کے لئے اپنا بدن گھسیٹ چکا ہو۔

”لڈوک! تم“ برادر مارک کے لہجے سے حیرت ظاہر تھی ”تم اپنے حجرے سے باہر دریاں کیا کر رہے ہو؟“

”میرے حجرے کو ایک اہم کام کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔“ لڈوک نے جواب دیا۔

”اور پھر اس نے برادر مارک کے کندھوں پر سے اپنی نظر گزار کر ڈانٹا کی طرف دیکھا۔ لڈوک کی آنکھوں سے بے پروائی اور عیاری کے طے جلتے جذبات جھانک رہے تھے۔“

”مادام!“ وہ بولا ”فادر شیشور نے آپ کو سلام کہا ہے اور اپنی مطالعہ گاہ میں آپ کو طلب کیا ہے۔ تشریف لائیے۔“

”لیکن مجھے ہدایت کر دی گئی ہے کہ..... برادر مارک نے احتجاج کرتے ہوئے

کنا شروع کیا۔

لڈوگ نے کسی بادشاہ کی طرح بڑی شان سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا دیا ڈانٹا اس شخص کے درجے اور مقام سے واقف نہ تھی اور نہ جانتی تھی کہ یہ شخص جس کا نام لڈوگ تھا، خانقاہ میں کیا تھا البتہ اتنی بات تو وہ بھی دیکھ سکتی تھی کہ اس نے برادر مارک کو گڑبڑا دیا تھا اس کے علاوہ اس کی ایک ایک حرکت سے حکیمانہ شان عیاں تھی۔ چنانچہ ظاہر ہوا کہ اس شخص کو خانقاہ میں کوئی بلند مقام حاصل تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر ہاتھ بڑھا کر کوئی پر سے اپنا چند تھمسیٹ لیا اور لڈوگ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

”برادر! حالات پر قابو حاصل کر لیا گیا ہے“ لڈوگ نے کہا۔ چنانچہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اور اس سے پہلے کہ برادر مارک کچھ کہہ سکتا یا نئے سرے سے بحث کا آغاز کر سکتا لڈوگ ڈانٹا کو دھکیل کر نہ صرف گزر گاہ میں لے آیا تھا بلکہ اسے آگے لئے جا رہا تھا۔ گزر گاہ میں آتے ہی ڈانٹا کو پھری آگئی اور اس کا مٹی چاؤ کہ وہ لوٹ جائے لیکن لڈوگ یوں تیز حیز قدم اٹھا رہا تھا جیسے وہ ڈانٹا کو وہاں پہنچا کر جہاں اسے پہنچانے کا حکم ملا تھا۔ اس فرض سے جلا از جلد سبکدوش ہو جانا چاہتا ہو۔ اور ڈانٹا سوچ رہی تھی کہ خدا جانے کیا ہوا تھا اور اس کے شوہر اور قادر شیشدور کو خدا جانے کون سی نئی بات معلوم ہوئی تھی کہ انہوں نے اسے بلا بھیجا تھا۔

آگے آگے چلتا ہوا لڈوگ ایک دروازے کے قریب آکر دک گیا۔ گردن تھما کر پیچھے آئی ہوئی ڈانٹا کی طرف ایک نظر دیکھا۔ دروازے پر دھک دی اور جواب کا انتظار کئے بغیر اسے کھول کر ایک طرف ہٹ گیا کہ ڈانٹا اندر داخل ہو جائے۔ ڈانٹا حجرے میں داخل ہو گئی۔

بے شک یہ قادر شیشدور کی مطالعہ گاہ ہی تھی۔ کتابوں کی الماریاں کمرے کی دیواروں کے نیچے پن کو ڈھانپ رہی تھیں، سامنے میز بھی تھی۔ پالش کی ہوئی، صاف اور چمکدار اور یہ چیزیں اس کمرے کو خود اس کے حجرے سے زیادہ قابل قبول بنارہی تھیں۔

لیکن اس کمرے میں قادر شیشدور نہ تھا۔ کوئی نہ تھا۔

اس نے اپنی پشت کی طرف سے دروازہ بند ہونے اور پھر قفل لگنے کی ہلکی سی آواز سنی۔ وہ ایک دم سے دروازے کی طرف گھوم گئی۔

لڈوگ غائب تھا۔ وہ اس کے ساتھ کمرے میں نہ آیا تھا۔ لیکن بند دروازے سے ٹپک لگائے کوئی اور کھڑا بھوکی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہی۔ وہی۔۔۔۔۔ کونٹ ڈرکیولا۔

شدید خوف اس کے دل کی گہرائیوں میں سے اٹھا اور اس کے بڑے بڑے بلبلے اس کے حلق میں آکر پھنس گئے، اس سے پہلے کہ وہ چیخ کر ان بلبلوں کو پھوڑ دیتی، ڈرکیولا نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا دیا اور اپنے خوفناک پنجہ سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ڈرکیولا کی آنکھیں یوں جل رہی تھیں جیسے ان کے پیچھے دوزخ کے شعلے سلگ رہے ہوں۔

ڈانٹا کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ ان جلتی ہوئی بھیاں آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی کہ کسی دم میں وہ گر پڑے گی۔ آنکھوں کے جلتے ہوئے ان دوزخی گڑھے میں جا پڑے گی۔ ڈرکیولا کی شیطانی آنکھوں کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ آگے۔ آگے۔ آگے۔۔۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہی وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلی تھی اس کے باوجود یہ عجیب بات تھی کہ وہ ڈرکیولا کی طرف کھینچ رہی تھی۔ یا یہ شاید اس کی روح تھی جو کھینچ رہی تھی وہ اسی جگہ کھڑی ہوئی

کارنگ زردی مائل سفید تھا۔

ڈریکولا نے اپنے ایک ہاتھ کی چھنگلا کے لائے اور تیز ناخن سے اپنے ننگے سینے پر اوپر سے نیچے تک ایک لکیر کھینچ دی اور پھر ایک جگہ جہاں انسان کا دل ہوتا ہے۔ جھنگلا کا یہ تیز اور لانا ناخن جڑ تک ڈریکولا کے سینہ میں اتر گیا۔ اس سوراخ میں سے خون نکل آیا۔

ڈریکولا نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر ڈانکا کا ایک ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنی طرف کھینچا ڈانکا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد نہ کی وہ بڑی فراہم داری سے کھینچی چلی آئی، ڈریکولا نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر ڈانکا کی گردن پکڑ لی اور اب وہ اس کے سر کو آہستہ آہستہ نیچے جھکا رہا تھا۔ اپنے سینہ پر اور اپنے سینے پر کے اس سوراخ پر جس سے خون رس رہا تھا۔

ڈانکا کا سر اس کے سینہ پر جھک گیا۔ اس نے ڈریکولا کا خون دیکھا تقریباً سیاہ اور دھنسا ڈانکا کی پیاس بھڑک اٹھی وہ اس خون کا مزہ چکھنے کے لئے بیتاب ہو گئی۔ لیکن وہ سحر ٹوٹ چکا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ چنانچہ ڈریکولا کی جلتی ہوئی آنکھوں کے اثر سے وہ آزلو ہو چکی تھی، وہ چونکی اسے ہوش سا آگیا اور اب وہ ڈریکولا کی بے دروانہ گرفت سے آزاد ہونے کے لئے دیوانہ وار جدوجہد کر رہی تھی۔ ڈریکولا اس درد سے کی طرح غرایا جو دوپچے ہوئے اپنے شکار کو چھوڑنے کے لئے کسی طرح چارہ نہ ہو اس نے جلدی سے ڈانکا کی گردن چھوڑ کر اس کے بال پکڑ لئے اور اس کے سر کو جبراً اپنے سینے پر اور اس خون کے رستے ہوئے سوراخ پر جھکانے لگا۔

ڈانکا بے تحاشہ ہاتھ چلا رہی تھی وہ ڈریکولا کے سینے پر گھونے چلا رہی تھی۔ اور کوشش کر کے وہ آخر کار اپنا سر ڈریکولا کے سینے پر سے اتار اٹھانے میں کامیاب ہو گئی کہ چیخ سکے اور ڈانکا کی ٹانگ شکاف چیخ مطالعہ گاہ میں گونج گئی۔ اور اس چیخ کا جواب

تھی اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو ڈریکولا کی آغوش میں محسوس کر رہی تھی۔ وہ دونوں دور دور کھڑے ہوئے تھے۔ تاہم وہ اس صغیریت کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ زیادہ سے زیادہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔

ڈریکولا مسکرایا۔ اس کا اوپری ہونٹ غیر قدرتی انداز میں اوپر چڑھ گیا وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ ڈانکا کی طرف اور اسے ٹھنڈے پیسے چھوٹ گئے اس کے باوجود وہ ڈریکولا کی آرزو کر رہی تھی وہ خوفزدہ تھی لیکن ڈریکولا کے سینے سے لگ جانا چاہتی تھی۔

ڈریکولا نے اپنا پتلا ہاتھ اٹھایا۔ وہ ڈانکا کے حلق کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ڈانکا نے ڈریکولا کا یہ حکمانہ اشارہ کچھ دیکھا اور کچھ نہ دیکھا کیونکہ اس کی نظر کو ان دو جلتی ہوئی آنکھوں نے اب بھی جکڑ رکھا تھا وہ اب بھی دونوں کے اس کھنڈوں میں محسوس جھانک رہی تھی ایک بار پھر ڈریکولا نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اور ڈانکا کی نظروں کے سامنے ہلا کر اس کے حلق کی طرف اشارہ کیا۔ اور اس دفعہ وہ سمجھ گئی، ڈانکا کا ہاتھ اپنے آپ یعنی ڈانکا کی مرضی سے نہیں۔ آہستہ آہستہ اوپر اٹھا۔ خود اس کے حلق کی طرف، اس نے گریبان پکڑ لیا۔ اس نے ایک معمولی سا جھکا دیا اور گریبان ”چرر“ سے پھٹ گیا ڈانکا کا حلق اب کھلا تھا۔ اس کا ہاتھ حلق پر بیٹھنے لگا اور اس کی انگلیوں نے اس ڈوری کو گرفت میں لے لیا۔ جو اس کی، ڈانکا کی، گردن میں پڑی ہوئی تھی۔ اس ڈوری سے ایک چھوٹی سی سنہری صلیب نکل رہی تھی ڈانکا کے ہاتھ نے گردن میں سے ڈوری کی گرہ کھول دی اور پھر اس نے وہ ڈوری مع سنہری صلیب کے ایک طرف پھینک دی۔

ڈریکولا مسکرایا۔

اپنی نظر کے سحر سے ڈانکا کو آزاد کئے بغیر ڈریکولا نے اپنا گریبان ایک ہاتھ سے پکڑ کر نیچے تک پھاڑ دیا اور اب اس کا سینہ عریان تھا پسیلیوں پر منڈھی ہوئی جھلی کی سی جلد

پائے گا۔ عمر بھر ملکوں ملکوں کی خاک چھاننے کے باوجود اسے تلاش نہ کر سکے گا اور کبھی بھی تلاش نہ کر سکے گا۔

”چارلس!“ اس کا دل پکار اٹھا۔

لیکن چارلس وہاں نہ تھا اور وہ ڈریکولا تھا جس نے اسے اٹھا رکھا تھا اور وہ اندھیری رات میں تیزی سے بھاگ رہا تھا اتنی تیزی سے کہ معلوم ہوتا تھا کہ پرواز کر رہا ہو اور یہ غفرت ڈانکا کو اس دونخ کی طرف لئے جا رہا تھا۔ جس کا نام ”زندہ مردوں کی دونخ“ ہے جو بھیاںک اور خون چوسنے والے ویسپائوں کی دنیا ہے۔



ڈریکولا کی ایک اور غراہٹ نے دیا۔

”ڈانکا۔ آ۔ آ۔“

ایک آواز، ایک پکار مطالعہ گاہ کے کواڑوں کی جھریوں میں سے اندر گھس آئی چارلس کی آواز، ٹینگ یہ چارلس کی آواز تھی لیکن بہت دور سے آئی تھی گزر گاہ کے انتہائی سرے پر۔

ڈانکا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوششیں تیز کر دیں آخر وہ اپنے آپ کو چھڑا کر دروازے تک بھاگ سکتی۔ اگر وہ کچھ دیر کے لئے اپنا منہ اس گھاؤ نے خون رستے زخم سے دور رکھ سکتی، اگر وہ چند منٹ کے لئے ڈریکولا۔۔۔“

کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کا چھٹا کانٹا دیا۔ ڈریکولا نے اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی۔ اس نے ڈانکا کے بال نہ چھوڑے، بلکہ وہ اسے لئے لئے کھڑکی طرف گھوم گیا۔

کھڑکی کے فریم میں لٹوگ کا چہرہ جڑا ہوا تھا۔ وہ ڈریکولا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے اشارے سے ڈریکولا کو اس طرف آنے کو کہا اور پھر اپنی کھنٹی سے بقیہ شیشہ بھی توڑ دیا۔

ڈریکولا کا ایک زور دار گھونسا ڈانکا کے سر پر پڑا، اس کا بھیجا مل گیا۔ بندر ہوئی ہوئی آنکھوں کے سامنے تارے سے تاج گئے اور پھر ان نے محسوس کیا کہ ڈریکولا اسے اپنی باہوں میں اٹھا رہا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگا اور اپنے ہاتھوں پر ڈانکا کو سنبھال کر اس نے کھڑکی کی طرف چھلانگ لگادی۔ جتنا کچھ شیشہ ٹوٹنے سے بچ رہا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔

ڈریکولا، ڈانکا سمیت باہر نکل چکا تھا۔

ایک بار پھر وہی بھیاںک خواب پریشان ڈانکا پر قبضہ ہوا چکا تھا چارلس اسے چھوڑ چکا تھا۔ بھول چکا تھا یا شاید اس تک پہنچنے میں ناکام رہا تھا اور اب وہ ڈانکا کو کبھی نہ

باب-9

بستر بچھا ہوا تھا۔ قادر شینڈور نے دوسری صلیب اس تابوت میں رکھ دی۔
 ”چھڑے والا“ قادر شینڈور نے کہا۔ ”شاید وہی وفادار کلیو ہوگا بشرطیکہ ہم اس کی
 غلامی کو وقار داری کہہ سکیں وہ ان دونوں کو دیپانوں کو۔۔۔۔۔“
 ”دونوں دیپانوں کو!“

”ہاں۔ کیونکہ تابوت دو ہیں۔ چنانچہ ایک ڈریکولا کا اور دوسرا۔“

”دوسرا؟“ چارلس نے پوچھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ دوسرا ویپائر کون ہے۔

”آپ کی بھالی۔ چنانچہ دن کی روشنی میں جب یہ دونوں ویپائر اپنے اپنے تابوت
 میں سو رہے تھے، کلیو ان تابوتوں کو چھڑے میں رکھ کر یہاں لے آیا کہ جب رات کا
 اندھیرا اتر آئے تو یہ دونوں عفریت اپنے اپنے تابوت میں سے نکل کر اپنا اپنا شکار
 حاصل کر لیں۔ لیکن اب۔۔۔۔۔“ اس نے تابوتوں کی طرف اشارہ کیا۔
 ”تب کیا؟“ چارلس نے سانس روک کر پوچھا۔

”اب یہ کہ چونکہ ہم نے دونوں تابوتوں میں ایک ایک صلیب رکھ دی ہے اس
 لئے رات کے ختم ہونے کے وقت ویپائر ان تابوتوں میں داخل نہ ہو سکیں گے۔ اب
 اگر ہم انہیں پکڑ نہ سکے اور فرار ہوتے رہیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ رات ختم ہو جائے گی
 اور دونوں ویپائر سورج کے رحم و کرم پر ہوں گے اور جب سورج کی شعاعیں براہ
 راست ویپائر پر پڑتی ہیں تو فنا ہو جاتا ہے۔“

”مطلب یہ کہ ہمیں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا چاہئے۔“ چارلس نے کہا

”ہاں۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔“ قادر شینڈور نے کہا، ”کاش کہ میں نے تمہارا یہ
 مشورہ مان لیا ہوتا کہ ہمیں فوراً قصر کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے۔ جب برائی کا پودا
 پھوٹ نکلے تو اسی وقت اسے اکھاڑ پھینکتا چاہئے کہ وہ بریہ کرتا درخت نہ بن
 جائے۔ اور جب شیطان آزاد ہو چکا ہو تو بلاناغیر اس کی بجائی کر دینی چاہئے۔“

قادر شینڈور چارلس کو ڈانٹا کے کمرے سے باہر لے آیا۔ اور باہر آتے ہی سیدھا
 خانقاہ کے صدارت دروازہ کی طرف چلا اور چارلس اس کے ساتھ تھا قادر شینڈور جلدی
 میں ضرور تھا لیکن وہ جو کچھ کر رہا تھا وہ بے سوچے سمجھے نہ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ
 معلوم ہو رہا ہے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہاں اسے کیا ملے گا۔

دروازہ کھول کر اس نے باہر دیکھا درختوں کے ایک جھنڈ میں چھڑا کھڑا تھا۔ قادر
 شینڈور کو جب یقین ہو گیا کہ چھڑے کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ اس نے دروازہ کھول
 کر باہر آگیا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا چھڑے کے قریب پہنچا اور بے دھڑک اس پر جا چڑھا
 اور اپنے مضبوط ہاتھ سے چارلس کا ہاتھ پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں اسے بھی اوپر تھمیت
 لیا۔

چھڑے میں دو لمبے بکس رکھے ہوئے تھے۔ بکس یا۔۔۔۔۔ تابوت قادر شینڈور نے
 ایک تابوت کا ڈھکن اٹھایا، تابوت خالی تھا البتہ اس میں باریک مٹی کی چکنی سی تہہ
 چھٹی ہوئی تھی جیسے کسی کا بستر لگا ہوا ہو۔

”ہم“ وہ بڑبڑایا۔ ”مجھے پہلے ہی سے سوچ لینا چاہئے تھا۔“

”کیا سوچ لینا چاہئے تھا؟“ چارلس نے پوچھا۔ وہ حواس باختہ ہو رہا تھا۔

”یہی کہ وہ اسی طرح یہاں آئے گا اور ضرور آئے گا۔“ قادر شینڈور نے کہا۔

اور اپنے چنے کے گربان میں ہاتھ ڈال کر دو صلیبیں برآمد کیں ایک صلیب اس
 نے اس تابوت میں جس کا ڈھکن اس نے اٹھایا تھا، مٹی پر رکھ دی۔ اور سر سے
 چارلس کو اشارہ کیا کہ وہ دوسرے تابوت کا ڈھکن کھول دے، چارلس نے ڈھکن
 کھولا۔ خانقاہ کی کھڑکی سے آتی ہوئی اندھی روشنی میں اس نے دیکھا کہ باریک مٹی کا

وہ کمرے سے نکل گیا تو دو راہب حجرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک

خیر نہیں ہے۔“

عورت کو اپنے درمیان پکڑ رکھا تھا جو کسی وحشی جانور کی طرح اپنی کو چھڑانے کی جندوجہد کر رہی تھی۔

چارلس لڈوگ کو بھول گیا۔ وہ ہر چیز اور ہر بات کو بھول گیا۔ وہ صرف ہیلن کو دیکھ رہا تھا اور صرف اس کی آواز سن رہا تھا۔ ہیلن کے شیطانی وجود سے حجرے کی فضا متعفن ہو گئی۔ اس کا دوزخی سانس فضا کی رگ رگ میں سا گیا۔ اور چارلس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس حجرے کا مقدس ماحول یکفخت بدل گیا ہو۔ اس کی طبیعت گہرائے لگی اور اسی گامی چاہا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے۔

چارلس ہیلن کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس نفرت انگیز اور گستاخانی صورت میں عورت کے خد و خال تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو تند و خشک مزاج اور چڑچڑی ہونے کے باوجود اس کی مخلص اور محبت کرنے والی بھابی تھی۔ لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ یہ عورت اس کی بھابی نہ ہو سکتی تھی اس کے ہونٹ کھینچے ہوئے تھے اس کے خونخوار دانت چمک رہے تھے اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔

فادر شینڈور اس کی طرف بڑھا تو وہ جنمی بھوت کی طرح اپنے آپ کو چھڑانے اور فادر شینڈور پر حملہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ چارلس بھی آگے بڑھ کر فادر شینڈور کے قریب جا کھڑا ہوا کہ جب ضرورت ہو تو وہ اس کی مدد کرے چارلس کو دیکھتے ہی وہ غرائی اور پھر اس نے ایک ققمہ لگایا۔ اس کا یہ ققمہ جیخ سے مشابہ تھا اور اتنا بھیانک تھا کہ چارلس کی ریزہ کی ہڈی میں ٹھنڈک کی لہر دوڑ گئی۔

اگر وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو کاٹنے میں کامیاب ہو گئی تو پھر وہ اس کا ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اسی کا یا ڈرا کیولا کا۔ چارلس نے اس کے خونخوار اور زہریلے دانتوں پر سے اپنی نظریں ہٹانے کی کوشش کی لیکن ہٹا نہ سکا۔

فادر شینڈور نے گردن گھما کر چارلس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”مسٹر چارلس! اس بلا کو دیکھئے اور یاد رکھئے کہ یہ وہ عورت نہیں ہے جس سے آپ واقف تھے۔ یہ وہ نہیں ہے جو آپ کی بھابی تھی۔ آپ کے بھائی کی بیوی مر چکی۔ یہ جو آپ کے سامنے ہے یہ ایک خول ہے اور اس خول میں جو ہے وہ ایک غیبیٹ روح ہے جس کی غذا انسانوں کا خون ہے چنانچہ ہم جس چیز کو خاک کریں گے وہ یہ غیبیٹ روح ہوگی جو اس خول میں ڈرا کیولا کی مہربانی سے ساگئی ہے۔“

چارلس خاموش رہا۔ وہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔

”لے آو اسے“ فادر شینڈور نے کہا۔

اور دونوں راہب جو اسے پکڑے ہوئے تھے۔ ہیلن کو گھسیٹ کر کراس میز کی طرف لانے لگے جس کے سامنے بیٹھ کر لڈوگ بڑی تندی اور توجہ سے دست کاری کے نمونے بنایا کرتا تھا۔ فادر شینڈور نے وہ دو چار برش اور کانڈ کے ٹکڑے میز پر سے ہٹا دیئے جو اب بھی اس پر پڑے ہوئے تھے۔

ہیلن دیوانوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ بھیڑیے کی طرح غراری تھی اور کتے کی طرح رو رہی تھی۔ اس کا پورا جسم کبھی تن جاتا تھا اور کبھی ڈھیلا پڑ جاتا تھا۔ وہ نافق الفطرت قوت سے لاتعلی چلا رہی تھی، تڑپ رہی تھی اور مروڑیاں لے رہی تھی لیکن دونوں راہبوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

راہب اسے گھسیٹ کر میز کے قریب لے آئے اور بڑی کوششوں کے بعد اس پر چٹ لٹا دیا اور اسے دوپچے رچھا۔ اب ایک تیسرا راہب حجرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نوکدار چوبی کھونٹ تھا جو ایک فٹ لمبا تھا۔ کھونٹ کی لکڑی حجرے کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اور اس تازہ لکڑی کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ یہ کھونٹا ابھی تیار کیا گیا تھا۔ راہب نے یہ کھونٹا فادر شینڈور کو دے دیا اور پھر اپنے ڈھیلے ڈھالے چننے میں ہاتھ ڈال کر ایک وزنی موگری برآمد کی۔

پھر ساکت ہو گیا۔

چارلس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”مسٹر چارلس!“ فادر شینڈور نے بڑی نرم آواز میں کہا۔ ”یہ مرحلہ طے ہو گیا۔“
اس نے چند قدم پیچھے ہٹ کر چارلس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے میز کے قریب لے آیا۔ چارلس دیکھتا نہ چاہتا تھا لیکن خود بخود اس کا نگاہیں میز پر جم گئیں۔

اور اس نے دیکھا کہ اب میز پر وہ ڈائمن نہیں بلکہ اس کی بھابی ہیلن لیٹی ہوئی تھی۔ وہی نقوش اور وہی خد و خال۔ اس کے بشرے سے اب وہ گھٹاؤ ناپن عیاں نہ تھا۔ اب یہ کسی روزنی بلا کا نہیں بلکہ اس کی بھائی کی اصل بیوی کا چہرہ تھا۔ اب اس پر کڑنگی کے بجائے ملاحظہ تھی اور خون کی پیاس کے بجائے ملکوتی سکون تھا۔ ہیلن پر سکون اور ابدی نیند سوری تھی۔



فادر شینڈور میز کی طرف گھوم گیا۔

ہیلن جسے میز پر چت لٹایا گیا تھا۔ ایک راہب نے اسے شانوں کے قریب سے اور دوسرے نے اس کی ٹانگیں ایسی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھیں کہ وہ اپنے سر کے علاوہ کوئی اور عضو ہلانہ سکتی تھی۔ اور وہ اپنا سر بیچ رہی تھی اسے دائیں بائیں تیزی سے ہلا رہی تھی۔ وہ تھوک رہی تھی، چیخ رہی تھی اور غرارہی تھی۔ یہاں تک کہ حجرہ اس کی ان غیر ارادی آوازوں سے گونجنے لگا۔

فادر شینڈور ہیلن کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے لمحے بھر کے لئے اپنی نگاہیں حجرے کی چھت کی طرف اٹھادیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کوئی دعا پڑھ رہا تھا۔

اور پھر اس نے وہ چوٹی کھوٹا ہیلن کی پائیں چھاتی پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے موگری بلند کی۔

چارلس نے اپنے معدے میں شدید اینٹھن محسوس کی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام کر دوہرا ہو جائے اور قے کر دے کہ یہ تکلیف کم ہو۔ اسے یہاں نہ آنا چاہئے تھا۔ وہ یہ کارروائی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کوئی انسان نہ دیکھ سکتا تھا۔

لیکن وہ ہیلن اور فادر شینڈور پر سے اپنی نظریں ہٹانہ سکا۔

دفعہ فادر شینڈور کا موگری والا ہاتھ بجلی کی تیزی سے نیچے چلا۔ اور ایک خون منجمد کردینے والی چیخ سے حجرے کی سنگین دیواریں کانپ گئیں۔ یہ ہیلن کی اور کسی بھی انسان کی چیخ نہ تھی۔ یہ عذاب میں پھنسی ہوئی ایک روح کی آخری چیخ تھی۔ موگری کی ایک ہی ضرب میں چوٹی کھوٹا نصف سی زیادہ ہیلن کے سینے میں اتر چکا تھا۔ اس کا ’کھونٹے کا‘ اوپری حصہ جو اس کے سینے سے باہر تھا لمحہ بھر تک تھر تھراتا رہا اور

اس وقت قادر شینڈور کے ہاتھ میں تھا۔

”لڈوگ!“ قادر شینڈور بڑبڑایا۔ ”ہم نے اس کے لئے کیا کچھ نہیں کیا اس کے باوجود اب وہ فرار ہونا چاہتا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟“
وہ کھڑکی کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے رات کے اندھیرے کے اسرار معلوم کرنا چاہتا ہو۔

”کیس ایسا تو نہیں کہ۔۔۔ اس کا وہ دوزخی آقا ڈرا کیو الا اسے بلا رہا ہو؟ لڈوگ۔۔۔ اس کے پاس تو بچے کی کوشش نہیں کر رہا؟“
اور دفعتاً ”قادر شینڈور تن کر کھڑا ہو گیا۔ ایک بار پھر وہ عملی قدم اٹھانے کے لئے تیار تھا۔

”آئیے مسٹر چارلس۔ اگر لڈوگ کے دل میں یہ آرزو اور یہ طلب بیدار ہو چکی ہے تو ہم اسے آزاد نہیں چھوڑ سکتے۔“

اور وہ گزرگاہ میں چل پڑا۔ قادر شینڈور ایسے لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا اور اتنا تیز چل رہا تھا کہ اس کا ساتھ دینے کے لئے چارلس کو تقریباً بھاگنا پڑا رہا تھا۔ گزرگاہ کے ایک اندھیرے کونے میں وہ دونوں کسی چیز سے ٹکرا گئے۔ جو فرش پر پڑی ہوئی تھی دونوں گرتے گرتے بچے تو وہ چیز کراہنے لگی۔ یہ برادر مارک تھا جو بے سدھ اور گھمڑی بنا پڑا تھا۔ قادر شینڈور جلدی سے اس پر جھک گیا اور برادر مارک کا سر ٹٹولنے لگا۔ اس کے سر پر کسی ٹھوس دھننی چیز سے ضرب لگائی گئی تھی۔

”لڈوگ!“ قادر شینڈور بڑبڑایا۔ ”کہاں۔۔۔ ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ یہ ڈانٹا کی چیخ تھی اور چارلس نے اس کی آواز پہچانی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرف ہٹا بیوی کے حجرے کی طرف بھاگا۔ قادر شینڈور بھی اپنی بات اوسوری چھوڑ کر برادر مارک کو اس کے حال پر چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگ پڑا۔

حجرے میں موجود راہب رب العزت کی حمد گانے لگے اور چارلس اور قادر شینڈور سر جھکائے کھڑے رہے۔ اور خاموشی سے ہیملن کی مغفرت کی دعا مانگتے رہے۔

”آئیے مسٹر چارلس“ قادر شینڈور نے کہا۔ ”اس وقت آپ کو شراب کی ضرورت ہے۔“

اور جب وہ دروازے کی طرف چلے تو اس سے چند قدم اوجھر قادر شینڈور نے کسی آہنی چیز سے ٹھوکر کھائی اور وہ چیز ایک چھٹا کے کی آواز کے ساتھ فرش پر چند انچ تک لڑھکتی چلی گئی۔ قادر شینڈور نے جھک کر وہ چیز اٹھالی۔ یہ ایک آہنی سلاخ تھی۔ قادر شینڈور نمایاں طور پر چونکا۔ چارلس حیران تھا کہ اس میں چونکنے کی کیا بات تھی! قادر شینڈور حجرے کی کھڑکی کی طرف گھوم گیا۔ کھڑکی میں چار سلاخیں ہوا کرتی تھیں۔ دو سلاخیں بڑی مہارت سے کاٹ دی گئی تھیں۔ اور ان کئی ہوئی سلاخوں کا ایک ٹکڑا

بڑے اور بڑی خطرناک تیزی سے چھکڑے کو غیر ہموار راستے پر سے کھینچنے سڑک کی طرف چلے۔

”گھوڑے۔“ چارلس چیخا۔ ”گھوڑے لاؤ۔ جلدی۔“

”فکر نہ کرو۔ ہم ان کا تعاقب کریں گے۔“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”لیکن جلدت اور بدخواہی میں نہیں۔“

اور وہ واپس خانقاہ کی طرف چلا۔ لڈوگ زمین پر پڑا۔ لوٹ رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ فادر شینڈور نے شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن پھر فوراً ہی اس کا غصہ رحم اور ہمدردی میں تبدیل ہو گیا۔ لڈوگ غریب کا کیا قصور تھا؟ ڈرائیولا مانوق الفطرت قوتوں کا مالک تھا اور بے گناہ انسانوں پر اثر ڈال کر انہیں اپنا غلام بنا لیتا تھا وہ تو شکر ہے کہ ڈرائیولا ابھی ابھی زندہ ہوا تھا۔ صرف ہیلن کا خون پی سکا تھا۔ چنانچہ اس کی تمام قوتیں خود کرائیں تو وہ یوں بزدلوں کی طرح فرار ہونے کے بجائے اپنے ہاتھ کے ایک اشارے سے بھیڑیوں کی پوری فوج بلا لیتا۔ اور یہ بھیڑیے چارلس اور فادر شینڈور کی بوئیاں اڑا دیتے لیکن کونٹ ڈرائیولا زندہ ہوتے ہوئے بھی کھل نہ تھا۔ البتہ اگر وہ زندہ رہ گیا تو بہت جلد اپنی تمام شیطانی قوتیں حاصل کر لے گا اور اس کے بعد اسے فاکرنا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہوگا۔

خانقاہ کے دروازہ پر برادر مارک تین چار دوسرے راہبوں کے ساتھ فخر کھڑا تھا۔

”برادر مارک۔“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”لڈوگ کو اس کے حجرے میں لے جاؤ۔ اس کے ساتھ سختی نہ کرنا، لیکن ہوشیار رہنا، کیونکہ اب اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“

چارلس بہت زیادہ بے چین تھا۔ اس کے دل میں ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ اسے

دروازہ بند تھا۔ دونوں نے کواٹوں پر اپنے کندھے دے کر زور مارا تو وہ کھل گئے اور چارلس اور فادر شینڈور اپنے زور میں بیک وقت حجرے میں ور آئے۔ اور انہوں نے دیکھا کہ ڈرائیولا ڈانکا کو اپنی ہاتھوں میں کھینٹ کر کھڑی کی طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ شیشے توڑ کر وہ دوسری طرف نکل گیا۔ چھکڑا۔ فادر شینڈور نے کہا۔

وہ دونوں حجرے سے نکل کر گزرگاہ میں بھاگ پڑے۔ اور کچھ دیر بعد وہ خانقاہ کے صدر دروازے سے باہر اندھیری رات میں تھے۔ چھکڑا اپنی جگہ پر موجود تھا۔ لیکن اس میں دو گھوڑے جوت دیئے گئے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک انسانی سایہ بھی کوچوان کی نشست پر مستعد اور تیار بیٹھا ہوا تھا۔

ایک اندھیرے میں سے ڈرائیولا نکل آیا۔ وہ بے ہوش ڈانکا کو اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے ڈانکا کو تابوتوں کے بیچ میں ڈال دیا۔ اور خود اچک کر کوچوان کے قریب بیٹھ گیا۔ چابک کا سزا کارات کی تاریکی میں گونج گیا۔ اور گھوڑے خاموشی سے چھکڑے کو کھینچنے لگے۔ کوچوان ڈرا آگے کی طرف جھکا تو اس کے سر پر سے کپڑے کی بڑی ٹوپی جس نے اس کے نصف چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ کھسک گئی یہ کوچوان کوئی اور نہیں بلکہ کلیو تھا۔

دھلتا۔ کہیں سے ایک انسانی سایہ نکل کر چھکڑے کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔

”آقا۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔“

یہ آواز لڈوگ کی تھی اور یہ وہی تھا۔ جو چھکڑے کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

فادر شینڈور نے چابک کھلایا اور چھکڑے کی طرف بھاگا۔ چارلس اس کے پیچھے تھا۔ ڈرائیولا نے ان دونوں کو آتے دیکھا تو وہ غصے سے بھیڑیے کی طرح نہایت زور سے چیخا۔ اور لڈوگ کو بڑی ہمدردی سے ایک طرف ڈھکیل دیا۔ گھوڑے پھر آگے

”ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں؟“ فادر شینڈور نے کہا۔ ”نہیں بھی۔ جب ہم آپ کو یہاں لائے تھے۔ تو اس وقت آپ وقت اور فاصلے کا اندازہ لگانے کے قابل ہی نہ تھے۔“

”آپ کتنا کیا چاہتے ہیں؟“

”صرف یہ کہ یہاں سے قعر تک پورے ایک دن کی مسافت ہے۔ وہ بھی حیرت رفقار گھوڑے پر۔“

”تب تو اور بھی برا ہوں۔“

”نہیں بلکہ اس میں الٹا ہمارا ہی فائدہ ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”کچھ ہی دیر بعد رات ختم ہو جائے گی۔ اور دن کا اجالا پھیلتے ہی ڈرائیولا اپنی تابوت میں جاسوئے گا۔“

”لیکن ہم نے تابوت میں صلیب رکھ دی ہے اور آپ نے کہا تھا کہ اب ڈرائیولا اس میں گھس نہ سکے گا۔“

”ہم نے صلیب رکھ دی تھی تو کلیو اسے نکال کر پھینک دے گا۔ اپنے آقا کا بستر تیار کریگا۔ اور جب اس کا آقا تابوت میں لیٹ جائے گا تو پھر کلیو آپ کی بیوی کی نگرانی کرے گا۔ چنانچہ آپ کی بیوی دن پھر محفوظ رہیں گی یہ لیجئے۔“

اور فادر شینڈور نے بندوق میں کارٹوس بھر کر چارلس کے ہاتھ میں تھما دی اور خود اپنی میز کی درازیں کھول کر ان میں کسی چیز کو تلاش کرنے لگا۔

”مناسب ہو گا کہ اسے آپ ہی رکھیں۔“ چارلس نے کہا ”یہ آپ کی بندوق ہے اور اس کا آپ استعمال جانتے ہیں۔“

”ہاں لیکن میں نے صرف جانوروں کا شکار کیا ہے، میں انسانوں کو گولی مارنے کا

نہ لٹوگ کی فکر تھی اور نہ برادر مارک کی پرواہ۔ وہ تو جلد از جلد گھوڑے پر سوار ہو کر ڈرائیولا کے تعاقب میں جانا چاہتا تھا۔ ہاں میرا اس غریب کے تعاقب میں جو ڈانٹا کو لے اڑا تھا اور وہ اس خیال سے کانپ گیا۔ کہ اگر وہ ڈرائیولا کو قتل نہ کر سکے یا ڈانٹا کو اس کے پنجے سے نہ چمڑا سکے تو اس کی چارلس کی بیوی بھی قتل کی طرح ڈائن بن جائے گی۔ چنانچہ ایک ایک لمحہ جو گزر رہا تھا، ڈانٹا کو زندہ، مردوں کے جہنم کے قریب لے جا رہا تھا۔

لیکن فادر شینڈور پر سکون تھا، چنانچہ اس نے چارلس کو اپنے ساتھ اپنی مطالعہ گاہ میں چلنے کو کہا، موخر الذکر انکار نہ کر سکا، چنانچہ فادر شینڈور کے پیچھے چل دیا۔ وہاں پہنچ کر فادر شینڈور نے کتابوں کی ایک اناری کے پیچھے ہاتھ ڈال کر بندوق باہر نکال لی۔ خانقاہ میں بندوق؟ اپنی بے تابی کے باوجود چارلس اس بات پر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ واقعی عجیب بات تھی۔ کبھی کسی خانقاہ میں بندوق نہ رہی ہوگی۔ راہب تو لازمی جھگڑے اور خون خرابے کے قریب تک نہیں پھٹکتے۔

”ڈرائیولا، آپ کی بیوی کو لے کر سیدھا قعر کی طرف جائے گا۔“ فادر شینڈور نے اس طرح کہا۔ جیسے وہ جالات حاضرہ پر محض وقت گزاری کے لئے تہیہ کر رہا ہو۔ ”قعر میں پہنچتے ہی وہ محفوظ ہو گا اور پھر آپ کی بیوی کو ہم کسی صورت نہ بچا سکیں گے۔“

”تو پھر ہمیں.....“

”ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ ڈرائیولا کو قعر تک نہ پہنچنے دیں بلکہ اسے راستہ ہی میں روک لیں۔“

”تو پھر خدا کے لئے فوراً چلیئے فادر۔“ چارلس نے کہا ”آپ یہاں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور ایک دو گھنٹے میں وہ.....“

سی ہو گئی ہوگی۔۔۔۔۔ وہ ہوش میں تھی یا بے ہوش یہ تو چارلس نہ جانتا تھا۔ البتہ یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ ڈرائیولا کے قبضے میں تھی اور رات کا اندھیرا اترتے ہی وہ ہمیشہ کے لئے اس کی بن جائیگی جیلن کی طرح کونٹ ڈرائیولا کی دلمن بن جائے گی۔
وقت تیزی سے گزرتا رہا۔

قادر شینڈور اصرار کر رہا تھا کہ گھوڑوں کو ذرا سستا لینے دیا جائے۔ لیکن چارلس اس قدر بیتاب تھا کہ گھوڑے کو دم نہ لینے دینا چاہتا تھا انہیں مار مار کر اس وقت تک بھگاتا رہے جب تک وہ بے دم ہو کر گر نہیں جاتے۔
دوسرے ڈھل گئی۔۔۔۔۔ دور کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سہ پہر کی روشنی نرم پڑ گئی اور رفتہ رفتہ دن ختم ہونے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ چوراسے پر پہنچ جائیں گے۔۔۔۔۔ ہاں وہ چوراسا دور نہ تھا۔ جہاں سے ایک راستہ قعر ڈرائیولا تک جاتا تھا لیکن اب تک انہیں چھکڑا نظر نہ آیا تھا۔ یقین نہ آتا تھا کہ کلیو نے چھکڑے کی رفتار خطرناک حد تک تیز کر رکھی ہوگی۔ لیکن واقعات ہو چکے تھے وہ ناقابل یقین ہونے کے باوجود حقیقت تھے۔

قادر شینڈور نے اپنے گھوڑے کی لگائیں کھینچ لیں اور دندانے دار اور ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔

”ہمیں چھوٹا اور مختصر راستہ اختیار کرنا چاہئے۔“ قادر شینڈور نے کہا کہ ”ہم ڈرائیولا کے عین سامنے اس چھکڑے کو روک لیں۔ آئیے۔“

اور انہوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں وحشت ناک ڈھلانوں کی طرف موڑ دیں۔ ڈھلان جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ان کے گھوڑوں کی رفتار تیز نہ تھی، ایک طرف گھنے جنگل کے کنارے کنارے اوپر چڑھ رہے تھے۔ جھاڑیاں ختم ہوئیں اور اب ڈھلان سنگلاخ تھی۔ یہاں وہاں چھوٹے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے اور ان کے

علاوی نہیں ہوں۔“

”لیکن ڈرائیولا انسان تو نہیں ہے؟“

”بے شک۔ اسی لئے اس پر گولی اثر نہیں کر سکتی۔“

”پھر یہ بددق۔۔۔۔۔“ چارلس کا دماغ مارے پریشانی کے بالکل شس ہو گیا تھا۔

”کلیو کے لئے ہے۔ وہ ویسا ہی نہیں انسان ہے اور شاید آپ کو اس پر گولی چلانے کی ضرورت پڑ جائے۔ مسٹر چارلس! بوقت ضرورت میں اپنی خانقاہ کے اصولوں میں ردو بدل کر سکتا ہوں۔ لیکن وہ بھی ایک حد تک چنانچہ کلیو پر میں گولی چلا نہ سکوں گا۔ ہمیں۔۔۔۔۔ چند نئے نوکدار کھونٹوں کی ضرورت پڑے گی۔ آئیے آپ اور برادر مارک گھوڑوں پر زین کس دیں تب تک میں ڈرائیولا کو فنا کرنے کے انتظامات مکمل کر لوں۔“

رات کے آخری گھنٹے ختم ہو رہے تھے اندھیرا سمٹ کر افق مغرب میں ڈوبنے لگا تھا اور افق مشرق سے روشنی کے سوتے پھوٹ رہے تھے چارلس اور قادر شینڈور اپنے اپنے گھوڑے پر سوار اب تک اندھیرے میں اور اندازاً راستے طے کرتے رہے تھے لیکن اب وہ اپنے سامنے کچی سڑک پر چھکڑے کے پیروں کے نشانات دیکھ سکتے تھے۔ کچی سڑک پر پیروں کے ہلکے نشانات اور ان کے کناروں پر مردہ مٹی کی مٹی برابر ڈھیریاں اس بات کا پتہ دیتی تھیں کہ کلیو چھکڑے کو صحیح معنوں میں اڑالے گیا تھا۔ ڈرائیولا اپنے تابوت میں لیٹ چکا ہوگا۔ لیکن اس کے خادم نے چھکڑے کی رفتار کم نہ کی تھی اور ڈانکا۔؟

چارلس اپنے گھوڑے کو بے تحاشہ ایڑی مارنے لگا۔ ڈانکا کی اس وقت کی حالت کے تصور نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ خدا جانے وہ اب تک بے ہوش ہوگی یا ہوش میں آچکی ہوگی اور اگر اسے ہوش آگیا ہوگا۔ تو مارے خوف کے اس کی حالت وحشیوں کی

فورا ہی وہ دونوں سڑک پر نکل آئے اور آگے بڑھتے ہوئے چھکڑے کے راستے میں کھڑے ہو گئے چارلس نے بددق اٹھائی اور کوچیان کی نشست پر بیٹھے ہوئے کلیو کو اس کی زد میں لے لیا۔

کلیو لمحے بھر کے لئے دم بخود رہ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے وہاں ان دونوں کی موجودگی کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو، "نہتا" اس کے چہرے کے پٹھے ڈھیلے پڑ گئے اس کا منہ کھل گیا اور اس نے گھوڑوں کی لگا میں کھینچ لیں۔

بددق کی نالی عین اس کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی

قادر شیشور نے کہا "بس۔ بہت دور آگے اتر آؤ چھکڑے پر سے۔"

ایک لمحہ تک کلیو بے حرکت بیٹھا رہا جیسے وہ اس بات پر غور کر رہا ہو کہ قادر شیشور کے اس حکم کی تعمیل کرنا کہاں تک مناسب ہو گا۔ پھر وہ ایک طرف کھسک کر نشست کے کنارے پر آگیا اور اس کا دایاں ہاتھ لگام چھوڑ کر پلو کی طرف لٹک گیا۔ یکایک تاریک ہوتی ہوئی فضا میں بجلی شی کوئڈ گئی، کلیو کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو تھا اور اس نے اپنا چاقو والا ہاتھ بلند کیا۔ وہ چاقو قادر شیشور کی طرف پھینک کر مارنے کی تیاری کر رہا تھا، لیکن اس کے دل کی دل ہی میں رہی۔ ابھی اس کا ہاتھ جھکا بھی نہ تھا کہ چارلس نے بلبلی دیادی۔

گولی شاید اس کے سینے میں لگی تھی، کیونکہ گولی کے دھکے کو برداشت نہ کر کے وہ دھرا ہو کر انچ بھرا چھلا، گرا، نشست پر گھڑی بھرا چھلا رہا۔ اور پھسل کر ڈھرام سے سڑک پر آ رہا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا تھا۔ کلیو نے پھر حرکت کی۔ قادر شیشور چھکڑے کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کے قریب پہنچتا، گھوڑے خوف سے ہینا کر پیچھے ہٹے اور پھر ایک دم سے بھاگ پڑے اگر چارلس

گھوڑے ٹھوکر میں کھاتے اوپر چڑھ رہے تھے۔

اندھیرا ان سے زیادہ تیز ثابت ہوا۔ اور وہ ڈھلان کی چوٹی پر سے تیز دھارے کی طرح بہہ آیا تھا جیسے وہ ان دونوں کو روک دے گا لیکن وہ آگے بڑھتے رہے اور چڑھتے رہے۔

چارلس پوری طرح ناامید ہو چکا تھا، اس کے باوجود وہ گھوڑے کو آگے بڑھا رہا تھا۔ محض اس لئے کہ یہاں سے لوٹ جانا بھی اتنا ہی بے معنی تھا جتنا کہ اب سے یہ تعاقب نظر آ رہا تھا۔ وہ مایوس ہو چکا تھا کہ یکایک بائیں طرف تھرڈ ریکولا کی سیاہ دیواریں یوں نمودار ہو گئیں۔ جیسے پورا تھر کی جادو کے زور سے زمین میں سے نکل آیا ہو۔ عین سامنے راستہ تھا۔ اور کچے راستے پر چھکڑے کے پیوں کے تازہ نشانات نظر نہ آ رہے تھے۔

ڈر اکیولا کا چھکڑا اب تک تو اس طرف سے نہ گزرا تھا۔

قادر شیشور اپنے گھوڑے پر سے اتر آیا، اور اسے ایک درخت سے باندھ دیا، چارلس نے اس کی تقلید کی وہ دونوں اپنا دم درست کر رہے تھے کہ چھکڑے کے پیوں کی کھڑکڑاہٹ کی آواز سنائی دی چارلس اور قادر شیشور درختوں کے جھنڈ میں سے نکل کر سڑک کے اس موڑ کی طرف بڑھے جس کے دوسری طرف سے یہ آواز آ رہی تھی۔

آواز سے معلوم ہو رہا تھا۔ کہ چھکڑا، آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ گھوڑے شاید مسلسل سفر کرنے کی وجہ سے تھک گئے تھے موڑ پر چھکڑا نمودار ہو گیا۔ کلیو کوچیان کی نشست پر اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ چھکڑے کا ایک پیہر چھوٹوں میں اتر گیا۔ تو کلیو کے پیچھے چھکڑے میں رکھے ہوئے دو تابوت اکدم سے اچھل کر آپس میں ٹکرائے۔

قادر شیشور نے گردن گھما کر چارلس کی طرف دیکھا اور اپنی بھنویں اچکائیں

تاہوت پل کے کنارے پر سے بھی پھسل کر خندق میں جا پڑا خندق کا پانی بخ بن چکا تھا۔
چنانچہ تاہوت اس پر پھسلتا ہوا قصر کی کالی آلود دیوار تک چلا گیا۔
ایک اور تاہوت اب بھی چھکڑے میں رکھا ہوا تھا۔
چارلس اپنے گھوڑے سے اتر کر جھکے ہوئے چھکڑے پر جا چڑھا قادر شیشدور اس
کے پیچھے تھا۔ دونوں نے مل کر تاہوت کا ڈھکن اٹھایا تو اس وقت ان دونوں کے بوجھ
سے چھکڑا اور بھی زیادہ جھک چکا تھا۔



اچھل کر ایک طرف نہ ہٹ گیا ہونا تو گھوڑے اور چھکڑا اسے کھینچتا ہوا گزر جاتا۔
گھوڑے بڑی برق رفتاری سے آخری ڈھلان چڑھ رہے تھے اور ان کے منہ اور
پھڑکتے ہوئے نٹھنوں سے کف جاری تھا۔ جیسے کوئی ان دیکھا ہاتھ ان پر آتشی کوڑے
برسا رہا تھا۔ اور وہ بے تحاشہ اپنی دوزخی پناہ گاہ کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ قعر
ڈرا کیولا جو صرف تین فرلانگ میل دور تھا۔

چارلس اور قادر شیشدور نے اپنے گھوڑے کھولتے اور ان پر سوار ہوئے اور
انہیں چھکڑے کے پیچھے بھگا دیا۔

اچھتا کودتا اور جھومتا ہوا چھکڑا قصر کی خندق کے چوٹی پل کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔
اور دونوں متعاقب کرنے والوں سے کئی گز آگے تھا چھکڑے کی رفتار کا اندازہ اس بات
سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے پچھلے پہنچنے سڑک سے تقریباً ایک انچ اوپر تھے وہ
اسے چھو نہ رہے تھے۔ بے تحاشہ بھاگتے ہوئے گھوڑے خندق کے پل پر سے گزر
رہے تھے کہ چھکڑے کا ایک پچھلا پیسہ آڑھ میں پھنس گیا جس کا دوسرا برا قصر کی
دیوار میں مضبوطی سے لگا ہوا تھا۔ چھکڑا کے نٹھنوں کی جڑ چڑھتے ہوئے اس کے آہنی سازند
سلمان کی جھنکار اور پھٹنے کے ٹوٹنے کا چناخہ سنائی دیا۔ چھکڑے کے یوں اچانک تھم
جانے کہ وجہ سے گھوڑوں کو ایسا شدید جھکا لگا کہ ایک گھوڑا درد اور تکلیف سے چیخ
اٹھا۔ اور دوسرا اپنی اگلی ٹانگوں پر بیٹھ گیا۔

پہنچنے کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے چھکڑا آہستہ آہستہ ایک طرف جھکنے لگا۔ اس
میں رکھے ہوئے دو تاہوتوں میں سے ایک پھسل کر چھکڑے کے کنارے تک آ گیا۔ اور
وہاں ٹھہر گیا۔ لیکن چھکڑا اور جھکا اور تاہوت چھکڑے کے کنارے پر سے پھسل کر چوٹی
پل کے کنارے پر آ پڑا۔

چارلس اور قادر شیشدور نے گھوڑوں کی لگائیں کھینچ لیں اور انہوں نے دیکھا کہ

چارلس چھترے پر سے لنگ کر پل اور وہاں سے چھوٹی سی عمودی ڈھلان پر سے کچھ بھاگتا اور کچھ بھسلتا ہوا خندق میں آگیا۔ خندق قصر کی دیوار اور کنارے کے درمیان ایک اندھیرے اور زبردست فشار کی طرح تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے چارلس نے برف کا معائنہ کیا اور اپنی ایک ٹانگ پر بدن کا پورا بوجھ ڈال کر اسے آزمایا۔ برف کافی مضبوط معلوم ہوتی تھی اور اگر وہ تابوت کا بوجھ سہار سکتی تھی تو یقیناً چارلس کا بوجھ سہار سکتی تھی۔

چارلس تابوت کی طرف چلا۔

سورج کی آخری سرخ کرن قصر ڈراکیولا کے بلند ترین برج کا ہاتھ چوم کر رخصت ہوئی۔ خندق میں گہرا اندھیرا ہو گیا۔ تابوت کے ڈھکن کے جوڑ چارلس کو نظر نہ آرہے تھے۔ البتہ اتنا تو بہر حال معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا ڈھکن مضبوطی سے بند تھا اور اس تابوت کے ڈھکن سے جس میں ڈانٹا تھی۔ مختلف ساخت کا تھا چنانچہ اسے کھولنا آسان نہ تھا۔ وہ ڈھکن کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

”وقت گزر گیا۔“ پل پر سے آواز سنائی دی۔

چارلس نے اپنی کوششیں ترک کر کے اور سر اٹھا کر پل کی طرف دیکھا۔ وہاں قادر شینڈور اور اس کا سہارا لئے ڈانٹا کھڑی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔

”چارلس! وقت گزر گیا۔ وہاں سے فوراً ہٹ آؤ۔“ قادر شینڈور نے پھر کہا۔

چارلس شش بچ کے عالم میں کھڑا رہا۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ کیا کرے وہ ڈرا سا تابوت کی طرف گھوم گیا اور عین اسی وقت تابوت میں لیٹے ہوئے ڈراکیولا نے ڈھکن اٹھا کر دور پھینکا اور ایک استخوانی ہاتھ نے تابوت میں سے نکل کر چارلس کی کلائی پکڑ لی۔ اسکی سرد اور پتلی انگلیوں کی گرفت آہنی تھی۔

چارلس نے اپنے قدم جمائے کو کوشش کی کہ اس عفریت کا مقابلہ کر سکے جو

تابوت میں ڈانٹا لیٹی ہوئی تھی اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ کھلی کیا تھیں پٹی ہوئی تھیں اور چارلس کانپ گیا۔ اس نے سوچا کہ ڈانٹا اسے نہ دیکھ رہی تھی اسے پہچان نہ رہی تھی۔ شاید وہ ڈائن بن چکی تھی۔ ڈراکیولا اس کا خون چوس چکا تھا۔ اور اسے اپنی دلسن بنا چکا تھا۔ لیکن نہیں۔۔۔ چارلس کا یہ خدشہ بے بنیاد تھا کیوں کہ فوراً ہی ڈانٹا کے رخسار پر ایک آنسو لڑھک آیا۔ اور اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

چارلس نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے کے اسے تابوت میں سے باہر نکال لے لیکن قادر شینڈور نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”آپ ان کی طرف سے بے فکر رہیے۔ میں تو یہیں ہوں البتہ آپ۔۔۔ اس کا فیصلہ کر دیجئے۔“

اور چارلس نے نیچے خندق میں نظر کی۔ جی ہوئی ٹھوس برف پر سے دھوپ کی روشنی ختم ہو رہی تھی۔ اور ڈراکیولا کا تابوت اس کے انتہائی سرے پر اور قصر کی دیوار کے قریب پڑا ہوا تھا۔

”آپ کو جلدی کرنی چاہئے“ قادر شینڈور نے کہا ”دن کی روشنی ختم ہو رہی ہے۔“

تاہوت میں سے نکل رہا تھا۔ اس کے پیر جمعنے کے بجائے برف پر سے پھسل رہے تھے۔

”گولی مار دیجئے اسے“ ڈاکا چیخ رہی تھی ”آپ اسے گولی کیوں نہیں مارتے؟“
”بے فائدہ ہے بیٹی“ قادر شینڈور کی آواز میں تاسف تھا۔ گولی اس پر اثر نہ کرے گی۔“

چارلس نے ڈاکا کو قادر شینڈور کے ہاتھ سے بندوق کھینچے دیکھا اس عرصے میں ڈراکیولا فتح مندانہ غراہٹ کے ساتھ تاہوت میں سے نکل آیا تھا۔ چارلس اور ڈراکیولا ہاتھ پائی کرتے قصر کی دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ چارلس نے ڈراکیولا کے جڑے پر ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ لیکن ہاتھ اس نے اس زور سے چلایا تھا کہ خود ہی توازن کھو بیٹھا۔ اس نے سنبھلنے کے لئے دونوں ہاتھ چلائے تو ڈراکیولا نے اس کا حلق دیوچ لیا۔ اور اسے قصر کی طرف دھکیلتے لگا۔

عین اسی وقت بندوق کے دھماکے کی آواز قصر کی بے حس دیواروں سے ٹکرائی۔ گولی ڈراکیولا کے تونہ لگی البتہ ان سے صرف چند قدم دور برف سے ٹکرائی۔ برف کی ایک لمبی سنے قاش اگھڑ گئی اور وہاں سے پانی کا چھوٹا سا فوارہ بل پڑا اور چارلس نے ڈراکیولا کو گھبرا کر ایک طرف ہٹے محسوس کیا۔

پانی کچھ دور تک سطح برف پر بننے کے بعد پھر اسی میں سما گیا۔

”ہاں۔“ قادر شینڈور چلایا ”مہتابانی۔۔۔۔۔“

مسلسل دو دھماکے سنائی دیئے۔ ڈراکیولا غرایا اور اس نے چارلس کو قصر کی دیوار تک ڈھکیل دیا۔ عین اسی وقت بندوق کی تیسری گولی ان کے سمت قریب برف میں آکر لگی اور اسی دفعہ برف کی سطح پر ایک ٹیڑھی میڑھی اور خطرناک دراڑ پیدا ہو گئی۔

غصے کی ایک پھنکار کے ساتھ ڈراکیولا نے چارلس کو چھوڑ دیا۔ وہ آزاد تھا اور اب

وہ کچھ دوڑتا اور کچھ پھسلتا ہوا خندق کے کنارے کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ برف اس کے پیروں تلے دب گئی اور سرد پانی اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔ چارلس لڑکھڑایا۔ منہ کے بل گرا اور سینے اور پیٹ کے بل برف پر اپنے آپ پھسلتا ہوا کنارے تک پہنچ گیا۔

جب وہ ساحل پر چڑھ رہا تھا تو اس نے بندوق کے کئے ایک مسلسل دھماکے سنے۔ قادر شینڈور نے بندوق میں نئے کارٹوس بھرے اور متواتر لمبی دہانے لگا۔ برف پر گولی کے ٹکنے اور پھر اس کے فوراً بعد ہی برف کے پھٹنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ سطح برف پر کئی دراڑیں پیدا ہو گئیں اور پھر مسلسل گولیوں کی تاب نہ لا کر وہ سب کی سب آپس میں بھٹکیر ہو گئیں۔ اور بج بستہ سطح سے پانی کے سوتے پھوٹ نکلے اور پانی برف کی سطح پر بننے لگا۔

ڈراکیولا دیوار میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پشے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس پر چڑھ کر اپنے آپ کو فنا ہونے سے بچا لے۔

چارلس دوڑ کر ڈاکا کے قریب پہنچ گیا۔ ڈراکیولا سے ہاتھ پائی اور پھر کنارے تک پہنچنے کی کوششوں نے اسے تھکا مارا تھا چنانچہ جب وہ اپنی بیوی کے قریب پہنچا تو بری طرح ہانپ رہا تھا لیکن خندق میں ادھر ادھر کھسکتے اور راہ فرار تلاش کرتے ہوئے ڈراکیولا کی کوششیں بڑی جاذب توجہ تھیں۔ بلکہ پٹانزم کا اثر رکھتی تھیں چنانچہ وہ اس کے طرف دیکھنے لگا۔

قادر شینڈور نے شت باندھ کر ایک بار لمبی پھر دیا دی۔

یوں معلوم ہوا جیسے کسی نے برف کا ایک سرا پکڑ کر اس سے ایک بڑا سا ٹکڑا نوچ لیا ہو۔ برف کٹ گئی۔ وہ حصہ جس پر ڈراکیولا کھڑا ہوا تھا۔ الگ ہو گیا۔ اور پھر وہ ایک طرف نیچے کی طرف جھکنے لگا۔

تھے وہ انہیں دیکھ کر سکرانے لگا۔

فتم شد



آئیڈیل
گلی مشہور
پرو پورا

آئیڈیل
گلی مشہور
پرو پورا

ڈرائیولا غصے اور انتقام کی آگ سے بے تاب ہو کر دونوں کے بڑاب میں جلا
غیث روح کی طرح بمیانک آواز میں چیخا، سامنے کھڑے ہوئے اپنے کامیاب دشمنوں
کی طرف دونوں ہاتھ چلائے، کرا اور بغل تک ڈوب گیا۔ ایک لمحے تک وہ برف کا
کنارا پکڑے رہا لیکن اس کی انگلیاں اندر کی طرف مڑی تھیں اور ایشیہ ہی تھیں یا
شاید وہ مٹی بن ہی تھیں۔ ہر حال یقین سے سمجھ میں کہا جاسکتا کیونکہ عین اسی وقت
برف کا وہ سرا جسے ڈرائیولا نے پکڑ رکھا تھا۔ ٹوٹ گیا اور برف کی تہہ کے نیچے بہتے
ہوئے پانی نے اس عفریت کو آہستہ آہستہ نکل لیا۔

غرق ہوتے وقت اس کا بمیانک لبوڑا چہرہ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اور اس کا منہ کھلا ہوا
تھا۔ عفریتوں کا وہ آقا شاید اپنی مدد کے لئے ان غیث روحوں کو پکار رہا تھا جو وہاں نہ
تھیں۔ اور پھر پانی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ سرخ دھاریوں والا سیاہ لبوہ
ایک سیکنڈ تک سطح آب پر مردہ چمکاؤ کے بازوؤں کی طرح پھیلا رہا اور پھر وہ بھی غرق
ہو گیا۔

چارلس نے ڈانکا کو سینے سے لگا کر اس کے ہونٹ چوم لئے لیکن قادر شیشدر
بندوق کا گھوڑا چڑھائے اب بھی اسی طرف دیکھ رہا تھا جہاں ڈرائیولا غرق ہوا تھا۔
اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ فنا ہو چکا ہے۔ اسے خوف تھا کہ کہیں وہ پھر زندہ ہو کر نہ نکل
آئے۔

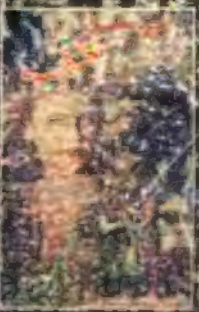
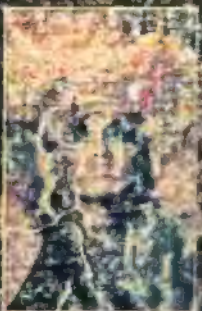
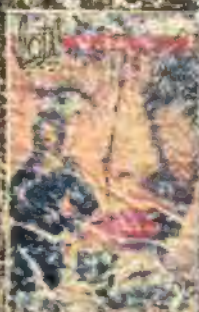
لیکن پانی کی سطح پر برف کے ٹکڑوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

اندھیرا گاڑھا ہو رہا تھا۔ قصر ڈرائیولا خاموش اور مہسوت کھڑا تھا اور اس قصر کا
مالک، کوئٹ ڈرائیولا فنا ہو چکا تھا۔

اب وہ کبھی واپس نہ آئے گا۔

قادر شیشدر نے چارلس کی طرف دیکھا جسکے ہونٹ ڈانکا کے لبوں سے چسپاں

لیپ کاؤن مارا گئی



کیا جان سہاگہ